

رومانی اصلاحی ناول

شاہ رخ زید

حمیدہ جبین



مکتبہ القریش اردو بازار لاہور

(۱)

اس ناول کے تمام کردار واقعات و مقامات فرضی ہیں ان کا کسی شخص یا جگہ یا واقع سے کوئی تعلق نہیں۔

سہ پہر کا وقت تھا۔ دن بھر کی گرمی سے گھبرائے ہوئے لوگ اب باہر نکل رہے تھے۔ ایک پرانی وضع کے مکان کے بڑے سے صحن میں ایک طرف کو بڑا سا تخت پوش بچھا ہوا تھا۔ جس پر سفید غرارہ قمیض پہنے ایک عورت بیٹھی نوکرانی سے صحن میں جھاڑو دلواری تھیں اور نوکر لڑکے کو بار بار ڈانٹ رہی تھیں۔

”اے گلو گنجت روٹیاں تو اتنی توڑتا ہے۔ کام ذرا سا بھی نہیں ہوتا چل بھرا بالٹی۔ اور اس طرف کو بھی چھڑکاؤ کر دے“

پھر وہ جلد ہی نوکرانی کی طرف ہوئیں۔ جلدی ہاتھ چلانا ابھی تک پکنے کے لئے کچھ آیا ہی نہیں۔ کیا کروں اکیلی جان ہے۔ کہاں کہاں جاؤں۔ وہ بڑھیا بھی ختم ہونے کا نام نہیں لیتی۔ لڑک گئی ہے۔ اب وہاں بھی جانا ہے۔ بیٹی۔

نجمہ آؤنا۔ ذرا نہا لیتی، گرمی نے تو ناس مار دیا ہے۔

موتی تو نہیں تھے تینوں سے ہو گئی پھینکا
میں آنکھیں کھول کر اس کی طرف سے

”اور کیا۔ نہ مرنی ہے۔ نہ کچھ۔ بیٹے کو دیکھو، دفتر سے آکر ماں کے پاس بیٹھ رہتے ہیں۔ یہ تو میل ہی دم ہے۔ گذارہ کر گئی“

رشیدہ بیگم کو تو بہانہ چاہیے تھا کہ وہ کچھ نہہرا گئے۔

”مگر بیگم۔ وہ نموکا کیا ہوگا۔ مسنا ہے اس کے قدم تو بڑے بھاری ہیں؟“

”لے ماں۔ مجھے تو دم آتا ہے۔ وہ کلہو سی بیاں ہی آئیگی۔ بڑی منحوس ہے۔

رشیدہ بیگم سچ مچ ڈر گئیں۔

”اے بیگم۔ اب کیا بتاؤں۔ پرسوں میں اُس گلی میں گئی تھی۔ محلے والیاں کہہ رہی تھیں کہ تم کو جو کوئی دیکھ لیتا ہے اُسے کھانا نصیب نہیں ہوتا۔ رحمت اپنی بہو سچ بتانے لگی“

”لے مجھے کیا معلوم نہیں۔ وہ تو ہے ہی منحوس۔ پیدا بھی نہیں ہوئی تھی۔ تو اللہ بخشتے رفیق بھیا کا ایکسڈنٹ ہو گیا۔ وہ جوانی میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اور جب یہ کلہو سی پیا ہوئی۔ پیدائش پر ہی چھوٹی دِلن چل بسیں۔ یہ تو بڑھیا کو ہی دم نہیں آیا۔

ایک دن کی سچی کو سینے سے لگا لیا۔ اور ہمارے لئے مصیبت کو جان کر دیا۔

جوانی نہیں دیکھیں، کس طرح چڑھی ہے، اب بڑھیا تو مر جائے گی۔ اور ہمارے گئے مصیبت پڑ جائے گی۔ رشیدہ بیگم اتھا چڑھا کر بولیں،

”یہ تو بڑی بڑی بات ہوئی۔ ننھیال میں کوئی نہیں ہے کیا؟“ رحمت لکڑیوں پر مٹی کا تیل چھڑکتے ہوئے پوچھنے لگی۔

”کوئی بھی نہیں ہے۔ ایک ماموں تھا۔ وہ نہ جانے کون سے جہان میں گم ہے۔

بچہ اپنے بال کھولتی ہوئی باہر نکلی۔ سچہ کا ناک نقشہ معمولی تھا۔ قد بہت اچھا تھا۔ ماں کے پاس بیٹھتی ہوئی بولی۔

”کیا دادی آاں کے ہاں مجھے بھی جانا پڑے گا؟“

”ہاں بیٹی۔ اب اس کے چل چلاؤ کا وقت ہے۔ تمہارا ہونا ضروری ہے دیکھتی نہیں اس اُتری کو پٹی سے لگی رہتی ہے۔

”میں۔ اسے تو کوئی مطلب ہوگا۔ میں کیا مطلب ہے؟“ سچہ تھک چڑھا کر بولی۔

”نہیں بیٹی۔ جانا ضروری ہے تم نہا لو۔ اور میں کپنے کے لئے کچھ دے دوں۔ رحمت بوا کو۔ جاؤ جلدی سے۔“

سچہ کندھے جھٹکتے ہوئے غسل خانے کی طرف چلی گئی اور رشیدہ بیگم باورچی خانے کی طرف۔ ادھر آؤ گلو۔ رشیدہ بیگم گلو کو دیکھ کر بولیں۔

وہ کُرتے کی آستین سے ناک رگڑتا ہوا قریب آیا ”جا جلدی سے قیہ بنوالا۔ اور رحمت سے کہنا کہ بھنڈیاں ڈال لے قیہ میں اب اس وقت اور کیا ہوگا۔ وہ جالی میں پڑا ہے گوشت۔ دیکھ باریک بنوانا“

گلو جالی میں سے گوشت نکال کر سٹر سٹا ہوا باہر نکل گیا۔ اور رشیدہ بیگم دل ہی دل میں ساس کے ختم ہونے کی دُعا کرتی رہیں۔ رحمت جھاڑو دے کر ہاتھ منہ دھو رہی تھی، اور مالک کی خوشنودی کے لئے نمک مزج لگانے لگی۔

”اے بیگم۔ یہ بڑی بیگم تو ملک ہی گئیں“ وہ پلو سے ہاتھ خشک کرتے ہوئے بولی۔

چنانچہ رحمت ابھی مگر قیمہ لے آتا ہے۔ بھنڈیاں ڈال لینا۔ ہم شام تک لوٹ آئیں گے۔
یہ کہتے ہوئے وہ باہر نکل گئیں۔

”نجمہ نہا کر بالِ مصلحہ رہی تھی۔ رشیدہ بیگم رقعہ پکڑے ہوئے آئیں۔
”اے بیٹی۔ اب چلو بھی۔“

”چلو آتاں۔ نجمہ نے بالوں کو ایک ربن سے باندھ لیا۔ اوپر چل پہن کر کھونٹی پر
ٹنگا ہوا نین کونوں والا برقعہ اتار لیا۔ دونوں ماں بیٹی برقعے پہن کر باہر نکل آئیں
ایک گلی کا فاصلہ تھا۔ فوراً ہی اصغری خاتم کا گھر آگیا۔ پُراقی سی سُرخ اینٹوں
والی عویلی میں بے حد اُداسی ٹپک رہی تھی۔ وہ دونوں آگے بڑھیں۔ برائے
میں نواری پلنگ پر ایک سفید سی کمزور ضعیفہ لیٹی ہوئی تھیں۔ قریب ہی کرسی
پر ایک ادھیڑ عمر کے مضبوط جسم آدمی، آنکھوں پر سفید حتمہ لگائے بیٹھے تھے۔
یہ ضعیفہ کے بڑے بیٹے شفیق الرحمن اور نجمہ کے والد تھے شفیق الرحمن کے
ہاتھ میں ماں کا ہاتھ تھا۔ نیچے دری پر محلے کی دو چار بوڑھیاں بیٹھی تھیں۔
ایک بوڑھی عورت رشیدہ بیگم کو دیکھ کر بولی۔

”اے دُہن، ایسا بھی کیا خون سفید ہو۔ صبح سے اب آئی ہو تم۔“

کیا کروں حالہ۔ رشیدہ بیگم رقعہ اتار کر قریب بیٹھے ہوئے بولیں۔ صبح سے
تھک گئی ہوں۔ تالاب والے مولوی صاحب کے پاس گئی۔ زبال نکلوایا
پھر بھی تسلی نہ ہوئی تو میرا بابا کے مزار پر گئی، وہاں دعائیں مانگتی رہی۔

گھر آئی تو نجمہ نے دروازہ کھول کر برہ حال کر لیا تھا۔ اسے دادی سے بڑا پیار ہے
وہ آنکھوں پر دوپٹہ رکھ کر زور زور سے ناک سکیڑنے لگیں۔ بوڑھی عورت
نے نجمہ کی طرف دیکھا تو اسے کوئی غم نظر نہ آیا بلکہ تارگی سی نظر آئی۔ پھر
اس کی نظر سامنے تخت پر بیٹھی نمو پر چاڑھی جو سفید دوپٹہ سے کان ادر
مانتا دھکے قرآن مجید پڑھ رہی تھی۔ چہرہ غم سے پیلا پڑ گیا تھا۔ اوپر بڑھنے
کے ساتھ ساتھ اُس کے آنسو اُٹے چلے آ رہے تھے۔

اُس کی بڑی بڑی خوبصورت آنکھیں رُونے سے سُرخ ہو گئی تھیں۔
اور خوب سوچ گئی تھیں۔ بڑھیا کا دل یتیم اور بے سہارا تھو کے لئے نہرپ
اُٹھا۔ رشیدہ بیگم نے نجمہ کو اشارہ کیا۔ نجمہ دادی کے پاس جا بیٹھی۔
لیکن ضعیف خاتون کی آنکھیں تخت پوش پر بیٹھی نمو پر لگی تھیں۔ اور پھر اُن کے
لب لپکپکپائے۔

”جی آتاں۔ فرمائیے۔ شفیق الرحمن قریب ہو کر بولے۔

”بیٹا۔ تم۔ نہا رہی بھتیجی ہے۔ اس کا خیال رکھنا۔ اس کا کوئی نہیں۔

میں تم سب کا حصہ دے چکی ہوں۔ یہ مکان نمو کا ہے۔“

”چچی آتاں۔ نجمہ بھی تو آپ کی اکلوتی پوتی ہے۔ فوراً ہی رشیدہ بیگم بولی تھیں۔

”بہو۔ التدر کھتے۔ نجمہ کے سر پر سب موجود ہیں۔ یتیم ہے اس کا دل نہ دکھانا۔“

رشیدہ بیگم کچھ اور کہنے والی تھیں کہ شفیق الرحمن نے تیز نظروں سے دیکھا۔ وہ

نفرت۔ غمناک سا کڑا کر علیحدہ بیٹھ گئیں۔ مگر بڑا بڑا پیسہ۔ نمونہ قرآن مجید جزدان میں لپیٹ کر اندر رکھ آئی۔ اور دادی کے پیروں کے پاس بیٹھ گئی۔

اچانک ہی ضعیفہ کا سانس اکٹھ گیا۔ منہ کھڑا کر اٹھی۔ بوڑھی عورت پانی لے آئی، شفیق الرحمن ماں کا سینہ ملنے لگے۔ مگر سانس قابو میں نہ آسکا۔ انھوں نے مرضیوٹی سے تمہارے ہاتھ تھام لیا اور کچھ تھوڑے ہاتھ پر گرفت ہو کر ڈھیلی پڑ گئی۔ آنکھیں نم ہو کر گڑی رہ گئیں۔

مویہ ہوش ہو کر گر پڑی۔ اور بیویوں نے ضعیفہ کو سبھا کر کے چادر اوڑھادی۔ شفیق الرحمن رومال سے آنسو خشک کرتے ہوئے باہر نکل گئے۔ اور بیویاں ادبھی آواز میں رونے لگیں۔

نموجب ہوش میں آئی تو اپنی بد نصیبی پر خاموش آنسو بہاتی رہی۔ اُسے دادی یاد آتی رہی بیچیں سے اب تک رکنے لاد سے پالا تھا انھوں نے۔ اور پھر خاندان کی مخالفت کے باوجود اُسے میٹرک تک پڑھوایا تھا۔ اب وہ کالج میں تھی سیکنڈ ائرمیں کہ وہ اچانک بیمار پڑ گئیں۔ اُسے کیا پتہ تھا کہ اُس کی قسمت کا ستارہ پھر گردش کرنے والا ہے۔ اُس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ دادی اماں بھی مر سکتی ہیں۔ اب وہ بالکل حیران تھی۔ چچی اور چچا سے اُسے کوئی اُمید نہ تھی۔ چچی کی نفرت بھری ناک ہوئی تو وہ ہمیشہ بھی رستی تھی۔ حالانکہ ایک لگی چھوڑ کر چچا کا گھر تھا۔ لیکن دادی اُن کی چچی سے کبھی خیر نہ کرتی تھی۔ اُسے وہ علیحدہ رستی تھی۔ اُن کے دو مکان اور

دو دکانیں تھیں۔ ان کا کرایہ ہی ان دونوں کے لئے کافی تھا۔ تمہو کو یاد تھا کہ وہ بچپن میں غم سے کھیلنے کے لئے چچی کے گھر گئی تھی تو اس نے ڈانٹ کر کھنگا دیا تھا۔ بھاگ جا۔ تو منحوس ہے۔ اور اس نے جب دادی اماں کو بتایا تھا۔ تو دادی اماں نے منع کر دیا تھا۔ اُن کے گھر جانے سے اور جوان ہونے کے بعد بھی شاید پانچ سالوں میں دو مرتبہ چچا کے گھر کسی تقریب پر جانا ہوا تھا۔ اب اس چچی کے پاس رہنا تھا۔ دادی کی شفقت محبت اس وقت اُس کے دل کو چیر رہی تھی۔ رات رات تک دادی اماں تمہو کو چھوڑ کر اپنی آخری جگہ پر جا چکی تھیں۔ سُرخ اینٹیں والی جھیلی میں دیرانی سی برس رہی تھی۔ رشیدہ بیگم معہ سنجہ وہیں تھیں۔ تمہو بے حال سی چار یا پائی پر لیٹ گئی۔ اُسے کسی نے نہ پوچھا۔ اس کے پوچھنے والی تو یہی گئی تھیں اب اُسے کون پوچھتا ہے۔

وہ چپ چاپ آسمان پر جھک گاتے ہوئے ستاروں کو دیکھنے لگی نیند اُس کی آنکھوں سے قطعی دور تھی۔ حالانکہ وہ کئی راتوں سے مسلسل جاگتی رہی تھی۔ اور پھر اُسے وہ محاورہ یاد آگیا۔ لوگ تارے کیوں گنتے ہیں۔ غم کی لمبی رات کشنی جو نہیں۔

تم تو تم بھی اپنے چچا کے ساتھ آجاؤ۔ مکان اب کرایہ پر چڑھے گا۔
 تم تو خالی خالی گھر کو گھورتی رہی۔ وہ ہر جگہ کو غور سے دیکھ رہی تھی۔
 جہاں پرائس نے بچپن سے اب تک قنت گزارا تھا۔ وہ کہہ بھی کیا سکتی
 تھی۔ بھتی جو لاوارث۔ ہر ایک جگہ دیکھ کر وہ اپنے دل میں عجیب سی گھٹن
 محسوس کر رہی تھی۔ اور محلے کی ایک عورت سے جب اسے سینے سے لگا یا تو
 سسک پڑی۔ آنسو جو بہنے کو بے قرار تھے بہہ نکلے۔

خالا آاں۔ اب کیا ہوگا۔ رادی جان مجھے اپنے ساتھ کیوں نہیں
 لے گئیں۔ وہ تو چلی گئیں۔ اب کیا۔ یہ گھر۔ خالہ میں یہاں سے نہیں
 جانا چاہتی۔ مجھے اس گھر سے بے پناہ محبت ہے۔
 وہ ہچکیوں کے درمیان بولتی جا رہی تھی۔

”بیٹی صبر کرو۔ قسمت میں جو ہونا تھا۔ ہو گیا۔ تم اکیلی یہاں کیسے
 رہ سکتی ہو۔ جب کہ تمہارا چچا موجود ہے۔ پھر سرگوشی کے انداز سے گویا ہو
 ”تمو۔ اب تمہیں سمجھداری سے کام لینا چاہیے۔ رشیدہ بیگم بہت چالا
 عورت ہے۔ تمہیں کسی سے دینے کی ضرورت نہیں۔ تم جائداد کی وارث
 ہو۔ کاغذ سنبھال کر رکھنا۔ کہاں ہے کاغذ۔؟“
 ”وہ تو رادی آاں نے وکیل کے پاس رکھوا دیے ہیں۔ تم تو آنسو
 بو پھینکتے ہوئے کہنے لگی۔“

نین دن تک سب لوگ مڑخ چوبلی میں رہے۔ نموسو کوکھ کر کاٹا ہو گئی تھی۔
 محلے کی بوڑھیاں اسے تسلی دیتیں۔ مگر رشیدہ بیگم نے ایک مرتبہ بھی اس کے
 سر پر ہاتھ رکھ کر اسے تسلی کے دو لفظ بھی نہ کہے تھے۔ وہ تو چڑھ گئی تھیں۔
 کہ اصغری خانم تمام جائداد تمہو کے نام کر گئی ہیں۔ اور ایک بات میں
 وہ آگے آگے تھیں۔ گھر کا سامان سمیٹ سمیٹ کر اپنے گھر بھجوا رہی تھی۔
 محلے والیوں نے بہتیرا سمجھایا کہ فی الحال آخری رسوم تو یہیں ادا کرو مگر
 رشیدہ بیگم کہاں ماننے والی تھیں۔ انھوں نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا۔
 ہم خود جانتے ہیں۔ غیروں کو دخل اندازی کی ضرورت نہیں بنتی ہو گیا
 ہے۔ اب وہاں سے روزانہ ختم درود ہوگا۔ کیا میں مسجد میں کھانا نہیں
 بھجوا سکتی۔ اور اس دن آن کی آن میں اصغری خانم کا جمع کیا ہوا سامان
 رشیدہ بیگم نے اپنے گھر بھجوا دیا تھا۔ صرف کاٹھ کباڑ ایک گودام میں بند
 کر دیا۔ اور خود بھی برقعہ اوڑھ کر یہ کہتی ہوئی چلی گئیں۔

”ہائے۔ مرنے والی بڑی عقلمند تھیں۔ دیکھا اپکا انتظام کر دیا۔ اسے معلوم تھا نا۔ خیر اب تم حوصلہ نہ مارو۔ اور رشیدہ بیگم کا ڈٹا مقابلہ کرو۔“

محلے کی خالہ اسے تسلیاں دیتی رہی۔ مگر اس کے آنسو بہتے رہے۔ آج اُسے ماں بھی یاد آرہی تھی۔ جسے اُس نے دیکھا بھی نہ تھا۔ اور با بھی یاد آرہا تھا۔ جس کی صرف وہ دادی اماں سے باتیں ہی سن سکتی تھی۔ اور کبھی جمہرات کو دادی اماں کے ساتھ قبرستان، بالاکرتی تھی۔ اماں نے اُسے بتایا تھا کہ یہ تمہارے باپ کی قبر ہے۔ اور یہ تمہاری ماں کی۔ تب وہ گھنٹوں ان قبروں کی مٹی ٹھیک کیا کرتی۔ اور سوچا کرتی کیسے باپ تھے میرے۔ اتنی جلدی مر گئے مجھے پیار بھی نہ کر سکے۔ اور پھر وہ اخیر یاد بھی نہ کر سکتی۔ دادی اماں جو تھیں۔ وہ کہا کرتیں۔ میں تمہاری ماں بھی ہوں۔ باپ بھی۔ مگر آج سے وہ دونوں بھی یاد آگئے۔

اُس نے بے بہا آنسو بہائے۔ سامان جاچکا تھا۔ شام ہو رہی تھی۔ کچھ ہی دیر میں اُس کے چچا آگئے۔

چلو۔ تم بوٹی۔ شفیق الرحمن خود بھی آبدیدہ ہو کر بولے تمہوایا پھر ان سے چٹ گئی۔ وہ پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگے۔ پگلی تم گھبراتی کیوں ہو۔ میں جو ہوں، چلو اپنے گھر۔“

اور تم محلے والیوں سے مل کر حسرت کی نگاہیں پوری حویلی پر ڈالتی ہوئی باہر نکل گئی۔

چچا نے حویلی کے دروازے پر تالا لگا دیا۔ اور وہ کو سمجھا تے ہوئے اُس کے ساتھ چلنے لگے۔ جونہی وہ گھر میں داخل ہوئے رشیدہ بیگم شوہر کے پیچھے پڑ گئیں۔

”اے میں نے کہا۔ وہ حویلی میں تالا بھی ڈالا بھی۔ سب کا ٹھکانا بھرا کہاں جائے گا؟“

”بیگم سائنس لو۔ دیکھو تمہو آتی ہے۔ اس کو تسلی دے۔ بیچاری بہت ہوتی ہے۔“
”تم جو اُسے دے رہے ہو تسلی۔ رشیدہ بیگم کہتی ہوئی ایک بیٹھا بیٹھا گئیں۔ تمہو خود ہی برقعہ اتار کر سہمی ہوئی صحن میں پڑے ہوئے پلنگ پر بیٹھ گئی۔ شفیق الرحمن کیسیانی ہنسی ہنستے ہوئے بیٹھا میں چلے گئے۔ وہ تو شروع سے ہی بیوی سے دبتے تھے۔

تمہو چپ چاپ خیروں کی طرح بیٹھی رہی۔ رحمت بوا صحن میں چارہ پائیا دیکھا کہ ان پر سفید سفید بستر لگا رہی تھی۔

گلو چارہ پائیوں کے آس پاس لوٹے سے پانی چھڑک رہا تھا۔ اُس نے دیکھا۔ رحمت بوا نے ایک کونے میں اس کا بستر بھی لگا دیا۔ لگو نے تخت پوش پر بستر بچھا دیا۔ اور رحمت بوا لگو کے ساتھ کھانے کی پلیٹیں لالا کر رکھنے لگی۔

شفیق الرحمن نے رشیدہ بیگم پر نہ جانے کیا جادو بھونکا۔ کہ وہ کچھ خوش نہ آنے لگیں۔ وہ دونوں ہاتھ دھو کر دسترخوان پر آ بیٹھے۔

”بجتمہ بیٹی آؤ۔ اور اپنی بہن کو بھی ساتھ لے آؤ۔ شفیق الرحمن نے پکارا۔
بجتمہ نے مٹو کی طرف دیکھ کر بغیر کہا۔ چلو کھانا کھا لو۔ تم جو چپ چاپ آؤ
دسترخوان پر جا بیٹھی۔ اس کا کھانا کبھی نہیں چاہ رہا تھا مگر وہ ساتھ
کے لیے بیٹھی رہی۔

شفیق الرحمن رشیدہ بیگم سے مکان کراتے پر دینے کی باتیں کرتے رہے
بجتمہ نے غمو سے پوچھا۔

”تم اب پڑھائی جاری رکھو گی۔“

”ضرور۔ تم تو آہستہ سے بولی۔“

”اب کیا پڑھے گی۔ میرا تو ارادہ ہے۔ تم بھی امتحان کے بعد لیس کر دو۔“
رشیدہ بیگم روتی سالتی میں لگائی ہوئی بولیں۔

”کیا حرج ہے۔ دونوں بہنیں پڑھتی رہیں۔ شفیق الرحمن بولے۔

”تمہاری تو ہوش ٹھکانے نہیں۔ جوان لڑکیاں ہیں۔ اب کہیں ہاتھ
پیلے کرنے ہیں۔ ان کے یا نہیں۔“

”ابھی کیا جلدی ہے۔ کم از کم بی۔ اے نو کر لیں شفیق الرحمن دوبارہ بولے۔

کیا نو کری کر داؤ گے۔ خاندان کی ناک کٹوانی ہے؟ رشیدہ بیگم غصے سے بولیں۔
”ضرورت پڑنے پر نو کری کر لی جائے تو کیا حرج ہے۔“

”تم لوگ تو انگریز بن گئے ہو۔ لڑکیوں سے نو کری کر داؤ گے۔“

”جاہلیت کی باتیں مت کیا کرو۔ نو کری میں حرج کیا ہے؟“

عزت ہے اور ضرورت کا جائز پہلو ہے۔ شفیق الرحمن بحث میں جانا
چاہتے تھے۔ لیکن بجتمہ نے ٹوک کر کہا۔

”اماں کی بات رہنے دیں بابا۔ انھیں کیا پتہ۔“

”اے۔ واہ لڑکی۔ مجھے کچھ پتہ ہی نہیں۔ تم پڑھ ہوؤں سے آج بھی میلہ دماغ تیز ہے۔“
”وہ تو ظاہر ہے۔ شفیق الرحمن ہنس کر بولے۔

تم جو چپ چاپ بیٹھی رہی۔

”بجتمہ بیٹی۔ تم نو کو اسے برابر والا کر دے دینا۔ وہاں پر بہ اپنا سا
رکھ دے گی۔ شفیق الرحمن کہنے لگے۔

”وہ کمرہ تو میں نے صاف کر دیا ہے ابھی۔ گودام کے ساتھ والی کوٹھری
ٹھیک کر لے گی۔ رشیدہ بیگم کو دم آ گیا کہ بجتمہ کے ساتھ تمور ہے۔ مخوس تمور۔“

”شفیق الرحمن کچھ بولنے ہی والے تھے کہ تم تو آہستہ سے کہنے لگی۔

”ٹھیک ہے جی اماں۔ میں وہی ٹھیک کر لوں گی۔ اور وہ ہاتھ دھو کر
کونے والے پلنگ پر چادر اوڑھ کر چپ چاپ لیٹ گئی۔

(۳)

دوسری صبح تمہارا اپنے لیے کوٹھڑی صاف کرنے لگی۔ کوٹھڑی میں بے حد کاٹھ کباڑ بھرا ہوا تھا۔ اُس نے خود ہی سب چیزیں اٹھا کر گودام میں بھریں۔ چھت پر بے انتہا جالے لگے ہوئے تھے۔ وہ بھی صاف کیے۔ اور زین گھنٹوں کی سخت محنت لے کر کوٹھڑی کو کمرے کا روپ دے دیا۔ پھر اُس نے خود ہی اپنے گھر والا کچھ خاص خاص سامان لکالا۔ دری۔ کرسیاں۔ میز۔ چارپائی اور پردے۔ جب وہ پردوں میں رتی پردہ رہی تھی۔ تو رشیدہ بیگم ادھر آنکلیں۔ پردے دیکھ کر وہ جل ہی گئیں۔ اُسے پردے تو نجمہ کے پاس بھی نہ تھے۔ اور نمونے کے سکھر پن سے تو وہ اور بھی جل گئیں۔ نجمہ کا کمرہ وہ خود ہی صاف کیا کرتیں۔ پردے دیکھ کر وہ رہ نہ سکیں۔ جھٹ بولیں۔ یہ پردے مجھے دے دو۔ بیٹھک کے پردوں کا رنگ خراب ہو گیا ہے۔ یہی لگا دوں گی۔

نمونہ کا دل دھک سے رہ گیا۔ مگر اُس نے سعادت مندی سے پردے رشیدہ کے حوالے کر دیے۔ پردے لے کر وہ خفارت کی نظر کرے بیٹھتی ہوئی چلی گئی۔

اس کوٹھڑی سے اُسے ڈر لگا کرتا تھا۔ اور اب اس کی کیا حالت ہو گئی تھی۔ نمونہ تنگ کر چور ہو گئی تھی۔ اُس نے اپنی کتابیں میز پر اکٹھی رکھ دیں۔ اور چارپائی پر اُجلا پلنگ پوش ڈال کر وہ باہر نکل آئی۔ گرد سے اور نقصان سے بُرا حال ہو رہا تھا۔ غسل خانے میں بالٹی پانی کی رکھ کر وہ تولیہ لینے اندر آگئی تو دیکھا کہ چچی اماں، رحمت بوا اور نجمہ، دادی اماں کے صندوق کے گرد ہیں اور تلاشی ہو رہی ہے۔ اُسے دیکھ کر نجمہ بولی۔

”یہ سوٹ اور یہ ساڑھیاں تو میں لوں گی۔“

”ہاں ہاں۔ ٹم ہی لینا۔ تمہارا ہی حق ہے۔ آج تک ٹم نے کونسی چیز لی ہے اُن کے ہاں کی۔“

تموچپ چاپ کھڑی ان کیڑوں اور ساڑھیوں کو دیکھتی رہی۔ جو دادی اماں نے اُس کے لیے منگوائی تھیں۔ مگر وہ کچھ بھی نہ کہہ سکی سوائے اس کے۔

”چچی اماں۔ تولیہ۔“

”اے اپنا تولیہ ڈھونڈ لو نا۔“ وہ جل کر بولیں۔

اور وہ بکسوں میں تولیہ تلاش کرنے لگی۔ تولیہ لے کر وہ مری ہوئی چال سے غسل خانے میں گھس گئی۔

نہا کر وہ اپنے کمرے میں بیٹھی محلے والی خالہ کی باتوں پر غور کرنے لگی۔ کہ واقعی

”چچی اماں - وہ زیور میری اتی کی نشانی ہیں۔ دادی اماں نے مجھے دیے تھے۔ میری اتی کی نشانی تو مجھ سے نہ چھینیں۔ تمہو کی آواز بھرا گئی۔ مگر رشید بیگم فوراً بولیں۔

”اے ہے اتی کی نشانی۔ دیکھا بھی اتی کو۔؟ منحوس پیلا ہوتے ہی کھا گئی اُسے ہر ایک ایسا جملہ تھا جس نے تم کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ وہ خود کئی بار غور کر چکی تھی۔ اور اُس نے کئی ایک جگہ سے سنا بھی تھا۔ کہ لوگ اسے منحوس سمجھتے ہیں۔ وہ کئی بچی سی رہ گئی۔ اتنے میں شفیق الرحمن کمرے میں داخل ہوئے۔

”کیا بات ہے۔ کینسا شوز ہے؟“

”شوز کیسا پوچھو اپنی بھتیجی سے۔؟ رشید بیگم غصے میں بولیں۔

”کیا بات ہے نموبیٹی؟“ انہوں نے تمہو سے پوچھا۔

بات کچھ نہیں آبا جان۔ دادی جان کے کچھ کپڑے اور زیور ہیں۔ وہ میں نے لے لیے ہیں۔ تمہو کہتی ہے کہ وہ چیزیں بھی مجھے دی جائیں۔ دیکھئے نا آبا جان، تمہو کے نام وہ اپنی ساری جائداد کر گئی ہیں۔ کیا میرا دادی اماں پردہ حق نہیں۔؟ نجمہ مظلوم صورت کئے بولنے لگی۔

اور چچا کی بات سن کر تمہو کا دل ٹکڑے ہو گیا۔ وہ واپس لوٹ گئی۔ اسے احساس ہو گیا کہ اس گھر میں اس کا کوئی نہیں۔ چچا بھی الماچی ہیں اور زن مرید بھی۔

اگر میں یوں چپ رہی تو میری ہر چیز پر قبضہ ہو جائے گا۔ اس کے لئے مجھے ضرور احتجاج کرنا ہوگا۔ کھانا رحمت گوا اس کے کمرے میں ہی دے گئی۔ کھانا کھا کر وہ اس کمرے میں گئی یہاں پر بکس تھا۔ اس میں اُس کے چند دھسے کپڑے تھے۔ مگر وہ اب خالی تھا۔ صرف فیٹائل کی چند گولیاں تھیں۔ جو ادھر ادھر لڑھکھکے لگیں۔ تمہو کو بہت غصہ آیا۔ وہ سیدھی چچی کے پاس گئی۔ رشید بیگم کھانا کھا کر چار پائی پر لیٹی پان کھا رہی تھیں۔ بڑبڑا کر اٹھ بیٹھیں اور تیوری چڑھا کر بولیں۔

”کیا ہے۔؟“

”وہ بڑے بکس کی چیزیں کہاں رکھوائی ہیں آپ نے۔؟“

آگئیں اپنی کرتوت پر۔ میں بھی کہوں، چپ بیٹھی ہے کل سے چیزیں سنبھالنی پھر رہی ہو۔ میں نے بھی کچھ کہا ہے۔ وہ چیزیں جانا چاہتی ہو تو سُنو۔ وہ سب نجمہ کے حصے کی ہیں۔ تم نے بہتیرا لے لیا ہے اب تک۔ جو کچھ تھا تمہارا ہی تو تھا۔ کیا نجمہ پوتی نہیں ہے۔ رشید بیگم ایک دم برس پڑیں۔

”جو کچھ بھی ہے۔ وہ زیورات اور کپڑے واپس کر دیجیئے۔ وہ میرے ہیں۔ تمہو نے دوبارہ کہا۔

”وہ واپس نہیں ہوں گے۔ وہ نجمہ کا حصہ ہے۔ اری ابھی بھی کلیہ ٹھنڈا نہیں ہوا۔ تمام جائداد تو تمہارا ہے ہی نام ہے۔

گمراہ کیا کرتی۔ جاتی کہاں۔ اُس نے فیصلہ کر لیا۔ کہ وہ اپنی پڑھائی شروع کر دے گی۔ اور پھر خود اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی کوشش کرے گی۔ وہ اپنی کتابیں ٹھیک کرنے لگی۔ ابھی وہ کتابیں ٹھیک کر رہی تھی کہ گلو آگیا۔ ”بی بی جی۔ بیگم صاحبہ جتنی ہیں کہ یہ کپڑے استری کر دو۔ وہ ڈھیر سارے کپڑے چارپائی پر ڈالتے ہوئے کہنے لگا۔

استری دو پہر میں۔ اور پھر کچھ سوچ کر بولی۔ اچھا رکھ دو کر دوں گی شام تک۔ گلو باہر نکل گیا۔

کوٹھڑی میں صرف ایک کھڑکی تھی۔ وہ کھڑکی بھی ڈیوڑھی کی طرف کھلتی تھی۔ جس کی موٹری دیوار نے روکی ہوئی تھی۔ اُسے بڑی گرمی لگ رہی تھی مگر سہیا کرتی۔ ہاتھ دالے ٹیکھے کی گرم ہوا اُس کے دل کو جلاتی رہی۔ خدا خدا کر کے قیامت کی دوپہر گزری تو وہ کپڑوں پر پانی کے چھینٹے دینے لگی۔ اور استری گرم کر کے دیر تک وہ استری کرتی رہی۔ بجھر کے کپڑے چچا کے چچی کے۔ ایسے وقت میں جب گھر کے لوگ گرمی سے گھبرا کر باہر نکل آئے تھے۔ اور صحن میں چھڑکاؤ کر کے اپنے آپ کو تسلی دے رہے تھے لیکن وہ سلاک رہی تھی۔ کپڑوں کی تہہ لگا کر وہ باہر نکلی۔ کپڑے اس کے ہاتھ تھے۔

”چی آماں۔ یہ کپڑے“

”رحمت لے لے کپڑے۔ اور بجھر کے الگ کر دے میرے اور ان کے

علیحدہ“ رشیدہ بیگم بولیں۔

رحمت کپڑے لے کر الگ کرنے لگی۔ تو سخت پویش کے ایک کونے میں بیٹھ کر منڈیر پر بیٹھے ہوئے کوٹے کی طرف دیکھنے لگی جس نے بے انتہا شور مچا رکھا تھا۔

میرا خیال ہے۔ آیا آتے گی۔ رشیدہ بیگم خوش ہو کر بولیں۔

”اور ساتھ نامید بھی“۔ نجمہ مہنس کر بولی۔

”اللہ کرے۔ آجائیں“ رشیدہ بیگم بولیں۔ اور اب تو منصور میاں بھی آنے والے ہیں لندن سے۔

اللہ رکھے۔ اب منصور میاں آجائیں گے۔ تو پھر ٹری بیگم کہاں زیادہ دیر رہنے دیں گی۔ نجمہ بیٹی کو۔ رحمت مہنس کر بولی۔

نجمہ شہزادہ کو کچھ فخر سے تم کو کی طرف دیکھنے لگی۔ جو بے پردہ سی کوٹے کو دیکھ رہی تھی۔ اُسے اتنا پتہ تھا کہ نجمہ اپنے خالو زاد سے منسوب ہے۔

مگر اُس نے ان میں سے کسی کو نہ دیکھا تھا۔ اس لیے اُسے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ابھی وہ یہی باتیں کر رہی تھی۔ کہ گلو خط لے آیا۔ نجمہ جلدی سے کھول کر پڑھنے لگی۔ آماں خالہ کا خط آیا ہے۔ وہ جلدی سے بولی۔

”اے اونچی آواز سے پڑھو نا“ وہ خوشی سے بولیں۔

اور نجمہ بلند آواز سے خط پڑھنے لگی۔

عزیزہ رشیدہ - ۹

السلام علیکم !

امید ہے کہ تم سب خیریت سے ہو گی۔ تمہاری ساس کی وفات کا سن کر بڑا دکھ ہوا۔ مرنے والی بڑی خوبیوں کی مالک تھیں۔ اللہ انہیں جنت میں جگہ دے۔ میری طرف سے شفیق بھئی سے بہت افسوس کرنا۔ اور میں خود بھی اس سلسلے میں آرہی ہوں۔ تاہم بھی ساتھ آئے گی۔ اب منصور کے آنے میں صرف دو ماہ رہ گئے ہیں۔ آتے ہی تمہارے پاس بھیج دوں گی۔ اور سنا دیکھا حال ہے۔ نجمہ کو بے حد پیار دینا۔ تاہم سلام دیتی ہے۔ فقط ”تمہاری آپا۔ فہمیدہ“

(۴)

دفت گزرنا گیا۔ ایک ماہ اور بیت گیا۔ تمور رشیدہ بیگم کی مخالفت کے باوجود کالج جانے لگی تھی۔ نجمہ اور تمور کے کالج قریب قریب تھے۔ لیکن وہ دونوں الگ جاتیں۔ تمور نے سائنس لے رکھا تھا۔ اور نجمہ نے آرٹس۔ نجمہ تانگے پر جایا کرتی تھی اور تمور پیدل گلو کے ساتھ۔ کچھ دنوں میں اسے ایسی لڑکیاں مل گئیں جو قریب قریب محلوں میں رہتی تھیں۔ پھر وہ ان کے ساتھ آیا جایا کرتی۔ رشیدہ بیگم سانپ کی طرح پھنکارتی ہوئی پھرتی۔ کہ تمور کالج منت جائے۔ لیکن تمور اس کا اثر نہ ہوتا تو وہ بان لیتی۔ مگر کالج جانا اس نے بندہ کیا۔ اب رشیدہ بیگم نے دوسری چلی۔ اس نے رحمت کو جواب دے دیا۔ کہ اب اخراجات بڑھ گئے ہیں۔ گھر میں جوان لڑکیاں موجود ہیں۔ گلو بھی ہے۔ دو دو نوکر نہیں رکھتے جاسکتے۔ رحمت کو تو اور گھر بہتیرے تھے۔ وہ فوراً ہی چلی گئی۔ اور تمور بے چارے کے سر پر باد چھی خانہ بھی آ پڑا۔

یہ ایک بھرپور وار تھا۔ امتحان قریب آرہے تھے۔ اور پھر گھر کا تمام کام۔

وہ گھبراہٹ ضرور کر گیا کر سکتی تھی۔ لگ گئی کام میں اور پڑھائی بھی ساتھ شروع رکھتی۔ اُس نے اپنا معمول بنالیا تھا۔ وہ بہت صبح اُٹھتی۔ نماز اور تلاوت کے بعد فوراً ناشتہ تیار کرتی۔ اپنا کمرہ صاف کرتی۔ اور پھر دوپہر کے کھانے کے لیے گوشت وغیرہ چڑھا دیتی۔ اور گلو کو ہدایتیں دے کر تیار ہو کر کالج چلی جاتی سوایس آنے کے ساتھ دوپہر کے کھانے کے برتن وغیرہ صاف کرتی اور دوسرے کاموں کے بعد رات کے کھانے میں لگ جاتی اور پھر کھانے کے بعد رات ایک ڈیڑھ بجے تک اپنی سیڑھی پر کھڑی رہتی۔ کیا مجال تھی کہ سچے سچے ایک کام کر ہی مانتے لگا جائے۔ اور محبوبی۔ اس پر بھی چین نہ تھا۔ چچی کی جلی کئی کئی سنٹنا پٹریں۔

وہ سہ پہر کو باورچی خانے میں چچا کے لئے چائے بنا رہی تھی کہ صحن میں شور مچ گیا۔ گلو دوڑتا ہوا آیا۔ پیڈی سے خالہ اور ناہیدہ بی بی آئی ہیں۔

متمو باورچی خانے کے دروازے پر کھڑی ہو کر دیکھنے لگی۔ ایک دہلی تیلی سی لمبے قد کی خاتون جو اپنے وقت میں بہت خوبصورت ہوگی۔ سفید لبل کا کرتہ سفید شلوار میں ملبوس ہاتھیں کالا برقعہ سکیڑ سے رشیدہ بیگم سے چپٹی ہوئی ہیں اور ایک مندرہ سالہ گول منڈل خوبصورت سی لڑکی نجمہ سے کھل رہی ہے تو یہ ہے ناہیدہ اور ناہیدہ کی امی۔

نمونے سن رکھا تھا۔ لیکن دیکھا نہیں تھا۔

وہ دروازے سے ہٹ کر چلے کے پاس آگئی۔ کیتنی میں سے پانی اگل اگل کر سرخ سرخ انگاروں پر پڑ کر ایک عجیب سا شور کر رہا تھا اُس نے ڈبہ اُتار کر چائے کی پتی اُس میں ڈال دی۔ باہر صحن میں شمشاد بیگم کے قہقہے گونج رہے تھے نجمہ اور ناہیدہ کی جلی جلی ہنسی پھیل رہی تھی۔

نمونے چائے میں پانی اور ڈال لے۔ رشیدہ بیگم کی آواز آئی۔ نمونے پانی اور ڈال دیا۔ اور پتی بھی اور ڈال دی۔ نمونہ تمہارے دیوڑھی بیٹی ہے نا۔ رشیدہ بیگم نے پوچھا۔ ہاں۔ کیا کروں۔ اب میرے پاس ہی ہے۔ رشیدہ بیگم اپنی بہن کی ہمدردی سے واقف تھی۔ وہ اسی لیے ہمدرد لہجے میں بولی۔

اچھا کیا۔ ثواب کا کام ہے۔ کہاں ہے سچی بلاؤ تو۔ بے چاری تنیم۔ فہمیدہ بیگم کے چہرے پر ہمدردی کی گہری ہنسی چھا گئی۔ ”ابھی آتی ہے۔ جاؤ گلو۔ تم کو بلاؤ۔“

تموڑے میں پیالیاں لگا کر خود ہی باہر آگئی۔ اُس نے ادب سے جھک کر فہمیدہ کو سلام کیا۔

فہمیدہ نے اسے گلے لگا لیا۔ اُن کے آنسو گرنے لگے۔ نمونہ کا دل تو پہلے ہی بکھرا ہوا تھا۔ وہ بمشکل اپنے آنسو ضبط کر رہی تھی۔ ناہیدہ بھی

اُس سے یوں چڑھ کر ملی جیسے مدتوں کی جان پہچان ہو۔

تمو۔ بڑی حیران ہوئی کہ رشیدہ سگم اور فہمیدہ سگم دونوں بہنیں ہیں لیکن دونوں کے مزاج کس قدر مختلف ہیں۔ وہ چائے لینے چلی گئی۔ چائے کیتنی میں ڈال کر وہ سوچنے لگی۔ کتنی پیاری ہے ناہیدہ اور اس کی امی کتنی ہمدرد۔ وہ محبت سے بستر جذبات لیے پھر باہر آئی۔ اور ان کے لیے چائے بنانے لگی۔

چائے کے دوران ناہیدہ کی میٹھی میٹھی نظریں اُس کا جائزہ لیتی رہی اور فہمیدہ سگم کی ہمدردی باتیں مدت بعد اُس کے دل پر ٹھنڈک پیدا کر رہی تھیں۔ چائے کے بعد وہ پھر باورچی خانے چلی گئی۔ اور رات کے کھانے کے لئے گوشت چڑھانے لگی۔ وہ گلو کو پاتی کے لیے کہہ رہی تھی۔ کہ اُس نے دیکھا۔ باورچی خانے میں ناہیدہ آگئی۔

”آپ یہاں۔ وہ مسکرائی۔ اوہ کتنی گرمی ہے یہاں۔ رحمت بوا کہاں گئی۔ جو آپ کام کر رہی ہیں۔ ناہیدہ اس کے قریب ہی بیٹھتی ہوئی بولی۔

”آپ یہاں کیوں بیٹھ گئیں۔؟ گرمی بہت ہے۔ اور دھواں بھی“

گھبرا کر بولی۔

”آپ بھی تو بیٹھی ہیں۔ میرا جی آپ سے باتیں کرنے کو چاہا۔ تو یہیں آگئی۔

”شکریہ۔ تم کو ناہیدہ اُس لمحے بہت پیاری لگی۔

”آپ پڑھ رہی ہیں نا۔؟“ ناہیدہ نے پوچھا۔

”ہاں۔ ایف اے میں۔ تم مصالحو ڈالتے ہوئے بولی۔

”نجمہ کے کالج میں۔؟“

”نہیں میں سائنس میں ہوں۔“

”آجھا۔ ابھائی جان بھی سائنس کے طالب علم رہے ہیں۔ وہ

ڈاکٹری کر رہے ہیں۔“

نمو چپ رہی۔ مگر فوراً ہی بولی۔

”مجھے آپ لوگوں سے ملنے کا بڑا اشتیاق تھا۔

”شکریہ۔ میں نے تو آپ کو آج ہی دیکھا۔ اس سے پہلے سن رکھا تھا۔

باہر آئیے نا۔ رحمت بوا کہتا ہیں؟ ناہیدہ پسینہ پونچھتے ہوئے بولی۔

”اے جی جی جان نے علیحدہ کر دیا ہے۔“ نمو کی آنکھیں گہری ہو گئیں۔

”ناہیدہ کچھ کہنے والی تھی۔ کہ نجمہ آگئی۔

”ناہیدہ۔ تم یہاں کیوں گرمی میں گھس گئیں۔ آؤ باہر خالہ جان پوچھ رہی ہیں۔“

”اے نجمہ۔ یہ تم کو بلے چاری۔ یہ تو گرمی میں بیٹھی ہیں۔ ناہیدہ اٹھنے

ہوئے بولی۔

”اُن کا کیا ہے؟ انہیں تو عادت ہے۔ نجمہ حقارت سے بولی۔

ناہیدہ کو یہ جملہ کچھ عجیب سا لگا۔ وہ بولی۔

”کیا مطلب؟ کیا یہ ہر وقت یہیں رہتی ہیں؟“

”آپ باہر بیٹھے۔ میں ابھی آتی ہوں۔ تم لوںے جلدی سے ناہید کی بات کاٹ دی۔ ناہید اور تجربہ باہر چلی گئیں۔“

رشیدہ بیگم نے آرڈر بھیج دیا۔ کہ چاول بھی نکال لو۔ لہذا تم کو باہر لے کی فرصت ہی نہ مل سکی۔ وہ چاول صاف کرنے لگی۔

اور پھر اُسی طرح اندھیرا ہو گیا۔ تم کو کام کرتی رہی۔ شفیق الرحمن بھی آگئے وہ ہمیدہ بیگم سے بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔ منصور کے متعلق پوچھتے رہے۔ تم لوںے باہر برآمدے میں دری پر کھانا لگایا۔ وہ سب ہاتھ دھوا کر بیٹھے۔ تم جوگ میں پانی ڈال کر دینے لگی۔ تو ہمیدہ بیگم کو بڑا تعجب ہوا۔

”رشیدہ کیا۔ رحمت بڑا نہیں آئیں آج۔؟“

”وہ آیا۔ دراصل وہ بوڑھی ہو گئی ہے۔ کہتی ہے۔ اب کام نہیں۔“

رشیدہ بیگم سے کچھ جواب نہ بن پڑا۔

”تو کیا تم نے اسے علیحدہ کر دیا؟“

”ہاں ایسا کرنا ہی پڑا۔“

”دیکھ کر پُرانی عورت تھی وہ تو، دوسری کا انتظام نہیں کیا، کیا۔؟“

”اے ہے۔ آپا تو کر ملتے ہی کہاں ہیں۔ کئی ایک سے کہہ رکھا ہے اب۔“

”اے بھی کوئی۔“

آؤ بیٹی تم۔ کھانا نہیں کھاؤ گی کیا۔؟ ہمیدہ بیگم اُسے واپس لے کر دیکھ کر بولا۔

”جی۔ وہ۔ آپ کھائیں۔ میں بعد میں کھا لوں گی۔ تم کو کھل گئی۔“

”ہم نہیں کھائیں گے۔ آپ کے بغیر۔“ ناہید نے کہا۔

تب تم کو کھسیانی ہنسی ہنستی ہوئی ناہید کے قریب آ بیٹھی۔ رشیدہ بیگم اور تجربہ خون کے گھونٹ پی کر رہ گئیں۔

کھانے کے بعد تم کو گلو کے ساتھ برتن صاف کرتی رہی۔ دیر تک باورچی خانے سے کھٹ پیٹ کی آواز آتی رہی۔ ہمیدہ بیگم اور ناہید کچھ کچھ سمجھ گئی۔ کہ تم کی عمر میں کیا وقعت ہے۔

پلنگ صحن میں ہی بچھائے گئے تھے۔ ناہید اور ہمیدہ بیگم کے لیے بھی بستر لگا دیے گئے۔ وہ نکلی ہوئی تھیں۔ اس لیے جلد ہی لیٹ گئیں۔

رات کے تقریباً گیارہ بج گئے تھے۔ تم نھنک سے چور اپنے کمرے میں جا گھسی۔ صبح اُس نے ٹیسٹ دینا تھا۔ اور اب تک ایک لفظ نہ پڑھ سکی تھی۔ اُس نے بتی روشن کی۔ اور کتاب نکال کر پڑھنے لگی۔ نھنک سے چور

جسم تھا۔ اور نیند سے بو تھل آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔ نہ جانے وہ کب

پڑھتے پڑھتے وہیں ہو گئی۔

دیوانی تھی۔ اور رشیدہ بیگم اور بھی زیادہ جلتی تھیں۔

رشیدہ بیگم اور صفیہ دونوں کی گودہری ہونے والی تھی۔ رشیدہ بیگم کے ماں نجمہ پیدا ہوئی۔ اور ابھی نمونہ پیدا نہ ہوئی تھی کہ رفیق الرحمن کا ایکسڈنٹ ہو گیا۔ وہ کورٹ موٹر سائیکل پر گئے تھے۔ مگر ان کی لاش واپس آئی۔ صفیہ اور اصغری بیگم زندہ درگور ہو گئیں۔

اصغری خانم کی مینائی کمزور ہو گئی۔ وہ چلتی پھرتی لاش کی مانند نظر آنے لگیں۔ اور صفیہ اندہ ہی اندر کھلتی رہی۔ اُسے رفیق الرحمن سے بے پناہ پیار تھا۔ رفیق الرحمن اُس کی زندگی تھے۔ ان کے بغیر وہ زندہ رہنا نہیں چاہتی تھی۔ دونوں ساس بہو کا سارا وقت آہوں اور آنسوؤں میں گزارتا۔ دو ماہ بعد نمونہ پیدا ہوئی۔ غم نے صفیہ کو بہت کمزور کر دیا تھا۔

رفیق الرحمن کی نشانی تم کو وہ نہ دیکھ سکیں۔ اور پیدائش کے وقت ایسی چمکی لی۔ جو انھیں ہمیشہ کے لئے میٹھی نیند سلا چکی تھی۔ لوگوں نے طرح طرح کی باتیں کیں۔ بچہ منحوس ہے۔ بچی سقر ختم ہے۔ گھر اُجاڑ کے رکھ دیا۔ اور ان باتوں نے اصغری خانم کو نمونہ سے ہمدردی پیدا کر دی۔ وہ پاگل سی ہو رہی تھیں۔ انھوں نے رفیق اور صفیہ کی نشانی کو سینے سے لگا لیا۔ اس کی پرورش میں رات دن ایک کر دیا۔ دیر تک

(۵)

اصغری خانم کے دوہی بیٹے تھے۔ بیٹی ایک بھی نہیں تھی۔ بڑے بیٹے شفیق الرحمن کی شادی انھوں نے ایک اچھے خاندان میں کی تھی۔ اور رشیدہ بیگم کو میاہ لائیں۔ مگر رشیدہ بیگم کا خاندان اچھا تھا۔ رشیدہ بیگم اتنی ہی کینڈہ پرور اور بد مزاج عورت تھی۔ اس کی ساس سے کبھی نہ بنتی۔ اور شادی کے کچھ عرصے بعد ہی وہ ساس سے علیحدہ ہو گئی۔ شفیق الرحمن اریگیشن (IRRIGATION) میں ایس ڈی او (S.D.O) بنے۔ گذر اوقات اچھی ہو رہی تھی۔ وہ ماں کو نہیں بھولے تھے۔ ہر روز ماں کے پاس جایا کرتے تھے۔

اصغری خانم جوانی میں ہی بیوہ ہو گئی تھیں۔ انھوں نے اپنے بچوں کی محبت میں زندگی گزار دی تھی۔

شفیق الرحمن کی شادی کا وہ کچھ سکھ نہا سکیں۔ پھر انھوں نے چھوٹے بیٹے کو بیٹا یا۔ رفیق الرحمن ماں کے بڑے فرما بڑا بیٹے تھے۔ انھوں نے دکالت کی تھی۔ اصغری خانم اپنی بھانجی صفیہ میاہ کر لائیں۔ صفیہ ساس کی

”نہیں آیا۔ آپ کے آنے کی ہنگامی کو اتنی خوشی ہے کہ وہ کالج نہیں گئی۔
 — تو روٹیاں وغیرہ پکا لیتی۔ سالن ٹم نے رکھ ہی لیا تھا۔
 ”ہائے ہائے ٹم نے بھی ایک ہی کبھی آیا۔ اسے تو روٹی پکانی آتی ہی
 نہیں۔ پڑھائی میں مصروف رہتی ہے۔“

”رشیدہ۔ کچھ تو خدا کا خوف بھی ہونا ہے۔ ابھی ابھی کروں جلی کالج سے
 آئی ہے اور ابھی روٹیاں پکا رہی ہے۔ ٹم ہی پکا لیتیں۔ فہمیدہ بیگم چھٹو
 لے آیا۔ وہ کون سا روز ایسا کرتی ہے۔ تو نوکر نہ ملنے کی وجہ سے چند
 دن کی تکلیف ہے۔“

”میں تو پرسوں سے دیکھ رہی ہوں کہ سارا کام وہی کرتی ہے۔“
 رشیدہ بیگم شرمندہ تو ہو گئی تھی۔

آسانی سے کیسے ہار مان لیتی۔ فوراً بولی۔

”میں تو خود ہی کام نہیں کرنے دیتی۔ مگر یہ تو مجبور ہی ہے۔“
 ”مجھے تو ترس آتا ہے۔ بے چاری لڑکی۔ اتنی ہی عمر میں کتنے غم
 دیکھنے پڑے ہیں۔ اسے“ فہمیدہ بیگم بھڑائی ہوئی بولیں۔

”ہے بھی تو منحوس۔ سچ کہتی ہوں آیا۔ جس دن سے آئی ہے جیسے
 ابھی کچھ گھر میں ہونے والا ہے۔ طبیعت بگڑی رہتی ہے۔ قدم
 واقعی بھاری ہے۔ رشیدہ بیگم کے دل کی بات آخر زبان پر آ ہی گئی۔

دیر تک بچی کو سینے سے لگائے رو بیا کر نہیں بچتی کی خاطر رشتے دار خاندان
 سب چھوڑ دیے۔ تموجوان ہو گئی مگر وہ نہ رہیں۔ نازوں کی پٹی ہوئی منو
 اب گدھے کی طرح جتنی رہتی۔

رشیدہ بیگم کے نھیاں میں بس ایک بہن تھی فہمیدہ بیگم اور ایک بھائی
 نصیر الدین تھے۔ جو اپنے بچوں سمیت افریقہ چلے گئے تھے۔ اور فہمیدہ بیگم
 پنڈی میں تھیں۔ فہمیدہ بیگم کے میاں مسرور احمد پنڈی میں اپنا کاروبار
 کرتے تھے۔ ان کا امپورٹ ایکسپورٹ کا کام تھا۔ فہمیدہ بیگم کے ایک ہی
 بیٹے تھے۔ منصور، وہ لندن میں ڈاکٹری کی اعلیٰ تربیت کے لیے گئے
 گئے ہوئے تھے۔ منصور نجمہ سے بچپن سے ہی منسوب تھے۔ اور ایک
 بیٹی تھی ناہیدہ۔ ناہیدہ اور منصور ایک ہمدرد ماں کی اولاد تھے ماں کی
 تربیت بھی نہایت اعلیٰ تھی۔ اس لیے رشیدہ بیگم اور نجمہ سے بالکل مختلف
 تھے۔ فہمیدہ بیگم دوسری دن میں جان گئی تھیں۔ ہوا یوں کہ تموج صاحب
 کالج سے لوٹ کر آئی۔ اور فوراً ہی کپڑے بدل کر باورچی خانے میں گھس گئی
 اور توا ڈال کر روٹیاں پکانے لگی۔

رشیدہ بیگم چیخ رہی تھی۔ کھانے کو دیر ہو گئی۔ یہ وقت آگیا۔ ساڑھے
 بج رہے ہیں۔

”فہمیدہ بیگم جلدی سے بولیں۔ آج نجمہ کالج نہیں گئی۔؟“

فہمیدہ بیگم حیرت اور رنج سے کہنے لگیں۔

توبہ توبہ رشیدہ۔ ایسا نہ کہو سب اللہ کے پیدا کیے ہوئے انسان ہیں۔ کوئی منحوس نہیں ہوتا۔ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ کتنی بھولی معصوم سچی ہے۔ تم لوگوں کے کہنے میں ممت اور خدا را۔ اسے بھرا برسمحبہ ثواب ملے گا۔

رشیدہ بیگم ہن کی لاعلیٰ پر ہنسیں۔ مگر رشتہ دوسرا بھی ہونے والا۔ اس لیے چپ ہی رہنا پڑا۔

تمو کھانا تیار کر کے کمرے میں لگا آئی تھی۔ اور ادب سے بولی۔ چلے خالہ جان۔! آج میں شرمندہ ہوں۔ دیر ہو گئی۔ کالج میں پکڑا۔

نظا۔ اس لیے۔ اس کے تمنا تے ہوئے گال دیکھ کر فہمیدہ بیگم کا دل کٹ گیا۔ اسے پیار کرتے ہوئے کھانے کے لیے چلی گئیں۔

(۶)

تمو ہن۔؟ ناہیدہ تمو کے دروازے پر کھڑی ہو کر کھینچنے لگی۔

”آؤنا۔“ تمو کتا میں سمیٹ کر بولی۔

”نہیں۔ آپ کی پڑھائی میں.....“

”کوئی بات نہیں۔ آئیے نا۔ وہ ہاتھ پکڑ کر اُسے لے آئی۔“

”آپ ہمارے ہاں پنڈی آئیں گی نا۔؟“

”جی ہاں۔ کیوں نہیں۔ نجمہ کی شادی پر تو ضرور ہی آؤں گی۔“

”اور ویسے نہیں۔؟“

”آؤں گی۔!“ تمو کے چہرے پر افسرو کی چھا گئی۔

”بھئی۔ ہمارے تہارے درمیان باتیں بڑے ادب سے ہوتی ہیں۔“

بوڑویہ تکلفات۔ ناہیدہ ہنستے ہوئے کہنے لگی۔

”ٹھیک ہے۔ تکلف میں اپنائیت نہیں ہوتی۔“

نجمہ سائے کی طرح ناہیدہ کے ساتھ تھی۔ اُس نے ہنسی کی آواز

لی تو اندر آ گئی۔

پاس رہتی ہو تو میں پل بھر کے لئے انھیں جدا نہ کروں کتنی اچھی ہیں۔
 نجمہ تم کو کی تعریف سن کر رہ نہ سکی۔ فوراً بولی۔

ہم ہوئے سیدھے سادھے۔ ظاہر ہے ہم کسی کو کیا پسند آئیں گے۔
 ”ارے یہ بات ہمیں۔ سیدھی سادھی کی بات نہیں۔ بات تو
 میل جول کی ہے۔ میرا مطلب ہے کہ تم دونوں میل جول رکھا کرو۔
 خالہ جان کو بھی تم سمجھایا کرو۔

تمو دونوں کی باتیں خاموشی سے سن رہی تھی۔ نجمہ نے اُن کی طرف
 گھور کر دیکھا۔ اور بولی۔

اچھا۔ میں سمجھ گئی۔ انھوں نے تم سے ہماری شکایتیں کی ہوں گی۔
 بھئی تم نے اُن کو کون سے دکھ دیے ہیں۔ یہ کیا کم ہے کہ انھیں اپنے گھر
 لے آئے ہیں۔ ورنہ آج ٹھوکرین کھاتی پھرتیں۔

نجمہ بہت ہو چکی۔ اب ایک لفظ بھی نہ کہنا۔ یہ تمہارے باپ کا گھر
 ہے۔ تو میرے بھی چچا کا گھر ہے۔ میرا بھی بہت حق ہے۔ تم غصے سے

چیخ کر بولی۔

تم رعب کس پر جاتی ہو۔ شرم نہیں آتی شکایتیں کرتے ہوئے۔ تم
 اسی لیے عزتی کرنا چاہتی ہو۔ ”نجمہ بھی چیخ کر بولی۔

نجمہ تم زیادتی کر رہی ہو۔ ناہید اُسے منع کر رہی تھی۔ لیکن وہ تو

”چلو ناہید۔ یہاں گرمی ہے۔ میرے کمرے میں چلو۔ وہاں نیکھا لگا۔
 ”بھئی تمہاری کیا بات ہے۔ مگر اس وقت مجھے یہاں بیٹھنا اچھا لگا
 ہے۔ ناہید نے جل کر کہا۔

”تم بھی بیٹھ جاؤ نجمہ۔“ ”تمو اخلاقاً بولی۔

وہ تیسری چڑھا کر پلنگ پر بیٹھ گئی۔

ماحول کچھ عجیب سا ہو گیا تھا۔ تمو ناہید کو خوش کرنے کے لئے بولی۔

”بسی ہماری بہن کے ہونے والے دولہا صاحب کب تشریف لارہے ہیں۔

”وہ۔ وہ بس اگلے جہینے کے شروع میں پہنچنے والے ہیں ناہید نے کہا۔

نجمہ کا سر غور سے کچھ اور ادبنا ہو گیا۔ مگر وہ کچھ بے وقوف بھی واقع ہوئی

تھی۔ ماں نے تم کو کے خلاف اُسے بہکا تو دیا تھا۔ اور وہ تم سے نفرت

کرنے لگی تھی۔ لیکن کبھی کبھی تنہائی میں اس کا دل چاہتا کہ وہ تم سے

باتیں کرے۔ مگر ایک دم اُسے نفرت یاد آجاتی۔

”کیا تم سے ناراض ہو۔ نجمہ۔“ ناہید نے آخر پوچھ ہی لیا۔

”نہیں۔ میں بھلا کیوں ناراض ہونے لگی۔“ وہ کھسیانی سی ہو گئی۔

”تو پھر بولتی کیوں نہیں۔“

”بس یونہی۔ طبیعت کی بات ہے۔ کہیں لگتی ہے۔ کہیں نہیں۔“

”تو لگا تو طبیعت۔ تم دونوں ایک گھر میں رہتی ہو۔ مائے تمہیں میرے

بس بہانہ چاہ رہی تھی۔

”بجئے۔ باتیں میں بھی نہیں سکتی۔ مجھے تم نے نوکرانی بنا دیا ہے۔
 تم سب کی خدمت کرتی رہتی ہوں۔ اس پر تم مجھے یہ صلہ دیتی ہو۔“
 ”نوکر کیا کھاتی نہیں ہو۔“ بجئے فوراً بولی۔
 ”شور سن کر فہیدہ بیگم اور رشیدہ بیگم دونوں ہی دوڑی آئیں۔
 ”کیا ہوا۔ یہ کیسا شور ہے۔“

”آں جی۔ یہ محترمہ مجھ پر رعب جارہی ہیں۔ فرمائی ہیں مجھے تم نے نوکرانی
 بنا دیا ہے۔“ بجئے آنسو بہاتے ہوئے ماں سے کہنے لگی۔
 ”تمو تر مجھ کاٹے کھڑی تھی۔ اور ناہیدہ حیران تھی کہ کیا ہو گیا۔
 ”اے ہے۔ تم ہوتی کون ہو۔ میری بیٹی پر رعب جانے والی
 سخوت کا۔ ڈھیر سہارے لئے ہی رہ گیا تھا۔ رشیدہ بیگم بھی برسنے لگیں۔
 ”بات کیا ہوئی ہے۔ ناہیدہ۔“ ”فہیدہ بیگم نے پوچھا۔
 ”بات کیا ہوئی ہے۔ میں جانتی ہوں۔ یہ بجئے کو دیکھ نہیں سکتی۔

اس سے جلتی ہے۔ میں تو پہلے ہی روتی تھی۔ مگر میری کون سننا تھا۔ دیکھو
 اگر اس گھر میں رہنا ہے تو یہ زبان درازی نہیں چلے گی۔ رشیدہ بیگم نے
 ناہیدہ کی بات سننے ہی نہ دی۔

”دیکھ رشیدہ تو خواہ مخواہ آپ سے باہر ہو گئی ہے۔ بات تو سنا لے۔“

”خالہ۔ ناہیدہ سے میری اور اماں کی شکایتیں کرتی رہتی ہے۔“ ”بجئے
 آنسو صاف کرتے ہوئے کہنے لگی۔

”ہائے ہائے۔ میں قربان۔ تو کیوں روتی ہے۔ روئے تیری جوتی۔
 آج آلیں تیرے آبا۔ میں فیصلہ کر کے رہوں گی۔“

”رشیدہ۔ بات تو سنو پہلے۔“ ”ماں ناہیدہ۔ بات کیا ہوئی۔“
 ”اتنی جان۔ بات تو کچھ بھی نہیں ہوئی۔ میں تو بجئے پر حیران ہوں۔ کہ
 اُنہوں نے بات کس لئے بڑھائی۔“

”تو نہیں جانتی ناہیدہ بیٹی۔ اسے تو میں ہی جانتی ہوں۔ چلو۔ تم
 لوگ کبڑوں یہاں آ بیٹھتی ہو۔ اللہ تم دونوں پر رحم کرے۔ اللہ تم سے
 سائے سے بچائے رکھے۔“

”تم نے اس لمحے ایک درد بھری آہ سے ناہیدہ کی طرف دیکھا اس کی
 بلے پناہ سوز والی نظریں ناہیدہ کے دل میں کھب کر رہ گئیں۔
 فہیدہ بیگم رشیدہ کو سمجھانے لگیں۔

”دیکھ رشیدہ۔ یہ بات اچھی نہیں۔ تم کو بھی اپنی بیٹی سمجھو۔ اور بجئے تم سے
 مجھے بالکل امید نہ تھی۔ تم تو سمجھا رہو۔ اور پڑھی لکھی تھی۔ تم اتنی سی بات کو
 کیوں طول دیتی ہو۔“

”آپ نہیں جانتیں آیا۔ یہ لڑکی کس طرح کی زبان دراز ہے۔ آپ چلیے۔“

اور پھر وہ نموت سے مخاطب ہوئی۔ دیکھ کیا رہی ہے۔ اب کھانا کون
پکاٹے گا؟

نموت چپ چاپ نکل کر باورچی خانے میں گھس گئی۔ اُسے باورچی خانے
سے ایک اُلس سا ہو گیا تھا اُس کا نم گسار سا تھی جو تھا۔ وہ جانتا تھا
کہ نموت نے کتنے آستو بہائے ہیں۔

یہ اُس کی اپنی دنیا تھی۔ پھر وہی چھوٹی بڑی دیکھیاں۔ چمچے اور مصالحہ
کے ڈبے۔ وہ اپنی دنیا میں کھو گئی۔ آج اس کا دماغ بالکل آوٹ تھا۔
اُدھر ناہید اپنے کمرے میں اپنی ماں سے کہہ رہی تھی۔ اماں گھر
چلو۔ یہاں اب نہیں رہا جائے گا۔

(۷)

نموت بہن۔ ناہید کی آواز میں بے پناہ ہمدردی تھی۔

”آؤ ناہید۔ اُس کی آواز جیسے بہت دُور سے آرہی تھی۔

وہیں معافی مانگتی ہوں تم سے۔ کل جو کچھ ہوا، میری وجہ سے ہوا۔

”وہ تو ہوتا رہتا ہے۔ تم کیوں اپنا جی ہلکا کرتی ہو۔ چار دن کے

لئے آئی ہو۔ میسجی خوشی رہنا۔ سچمہ تمہاری ہونے والی بھابی ہے۔

اس کو کیوں ناراض کرتی ہو!

”اللہ نہ کرے وہ میری بھابی بنے“ مجھے اُس سے نفرت ہو گئی ہے۔

”ایسا نہ کہو“ نموت نے ڈر کر ناہید کے منہ پر انگلی رکھ دی۔

”میں تو کہوں گی۔ بھائی جان سے کہوں گی۔ امی نے تو دیکھ ہی لیا“

”پاگل نہ بنو“ میرے لئے تم اتنی بڑی بات کیوں کہتی ہو“

”مجھے نہیں معلوم تھا کہ خالہ جان نے سچمہ کو ایسی تربیت دی ہے

کاش میں نہ آتی“

”پگلی بہن۔ میں نے سنا ہے تم جا رہی ہو۔“ نموت کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

”ہاں۔ اس ظلم کی نگری میں مجھ سے نہیں رہا جاتا۔“

وہ ہنس دی۔ ایسی ہنسی جس میں غم کی آمیزش تھی۔!

”مَت جاؤ۔ ناہید۔“

”کیوں۔“

”کچھ دن تو اچھے گزر جائیں گے۔“

”نم اس ظلم کے خلاف احتجاج کیوں نہیں کرتیں۔“

”تمو۔“

”کس سے کروں۔“

”چچا سے۔!“

وہ زور سے ہنس دی۔

”کیوں۔“

”کچھ نہیں۔ تم خواہ مخواہ پریشان ہو رہی ہو۔ مجھے تو عادت ہو گئی ہے۔“

میرے لئے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“

”میں تو سوچ سوچ کر تھک گئی ہوں۔ کیا کیا جائے آخر؟“

”زندگی گزر رہی ہے۔“

”کس کام کی۔“

میں نے اتنی سے یہاں تک کہا ہے کہ تم کو اٹھ لے چلیں۔

”وہ کہتی ہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“

”ٹھیک ہی تو کہتی ہیں۔“

”تم خود کو مضبوط بناؤ۔ تم اچھی خاصی جائیداد کی مالک ہو۔“

یہ ایک کہیں۔ تم دس سناؤ۔ ناہید نے اُسے مشورہ دیا۔

”میں بہت کمزور لڑکی ہوں ناہید۔“

”اُیسے کچھ نہیں ہوگا۔ میرا دل کڑھتا رہے گا۔“

”میں شکر گزار ہوں ناہید۔ مجھے کسی کی محبت تو ملی۔ ہر ایک مجھ سے

نفرت تو نہیں کرتا۔ تمہیں تو مجھ سے ڈر نہیں لگتا۔ میرے متخوس سایہ

سے تو وہم نہیں آتا۔ اُس کی آنکھیں چھلک پڑیں۔

”اُیسی باتیں نہ کرو۔ تمو۔ میرا دل دکھتا ہے۔ ناہید سچ سچ رو دی۔“

ناہید۔ تم کو آواز پہنچی بن گئی۔

”دیکھا ہے۔“

”مجھے خط لکھو گی۔ اُس کی آواز میں بڑی حسرت تھی۔“

”ہاں تمو۔ ضرور لکھوں گی۔ اور جب تمہارا دل زیادہ دکھی ہو۔“

تو مجھے ڈھیر سارے خط لکھ دیا کرتا۔

”بہت بہت شکریہ ناہید۔ اب مجھے کوئی غم نہیں۔ مجھے تسلی ہے

کہ میرے لئے بھی کسی کا جی کڑھتا ہے۔ کوئی میرا بھی ہے۔ کسی کو میں

بھی اپنا کہہ سکتی ہوں۔

”شکر یہ ناہید“ وہ جذبات کی رو میں بہہ گئی۔

”ناہید۔؟ باہر فہمیدہ سگیم کی آواز گونجی۔“

”بیٹی۔ گاڑی کا وقت ہو گیا۔“ وہ قریب آکر بولیں۔

”تمو کھڑی ہو گئی۔ اُس نے ایک نظر فہمیدہ سگیم پر ڈالی اور پھر اُن کے پیروں پر گر پڑی۔“

فہمیدہ سگیم نے اُسے سینے سے لگایا۔ اور اُس کے بال سنوارتے ہوئے بولیں۔

صبر اور حوصلہ۔ بہت بڑی چیز ہے۔ یہی میری نصیحت ہے۔ صبر اور حوصلے کے لفظ کو دل میں بٹھالو۔ اللہ تمہاری مدد کرے گا۔ میں سب کچھ جانتی ہوں میری سچی۔ مگر میں کچھ بھی نہیں کر سکتی۔ انتشار اللہ میں تمہیں کچھ دنوں کے لئے بلاؤں گی۔ منصور آجائیں۔ پھر۔

تمو ناہید سے رو کر ملی۔ اور پھر ناہید اور فہمیدہ سگیم باہر چلی گئیں۔ رشیدہ اور نجمہ اسٹیشن ساتھ جا رہی تھیں شفیق الرحمن بھی ساتھ تھے۔ باہر ناگہ آچکا تھا۔ وہ ایک بار پھر، خدا حافظ کہتے ہوئے باہر نکل گئیں۔

دنگو سامان لے جا چکا تھا۔

تمو ڈیوڑھی میں کھڑی جاتے ہوئے نانگے کو دیکھتی رہی۔ پھر مارے ہوئے جوار میں کی مانند باورچی خانے کوٹ آئی۔

چھوٹی بڑی دیگچیاں اُسے گھورنے لگیں۔

اور پھر وہ تسلسے میں آٹا ڈال کر گوندنے لگی۔

”کتنی اچھی تھی ناہید۔“

”کتنی بکنہ تھی اُس کی آتی۔“

اور شاید منصور بھی ایسے ہی ہوں۔

کیسے کیسے لوگ ہیں دُنیا میں۔

آٹے میں پانی زیادہ ڈل گیا تھا۔ اُس نے مٹھی بھرا آٹا اور ڈال لیا اور اس دُنیا میں کھو گئی۔

(۸)

(۸)

گھر کے کام کی زیادتی نے تم کو پریشان کر دیا تھا۔ وہ پڑھائی کے سلسلے میں اچھی نہ چل رہی تھی۔ اور اس دن کے واقعے کے بعد رشیدہ اور بختہ اُسے اور بھی نفرت سے دیکھنے لگی تھیں۔

وہ باورچی خانے میں ہانڈی چڑھاتے ہوئے نوٹن یاد کر رہی تھی کہ رشیدہ آدھمکی۔

”سالن بدمزہ ہوتا ہے۔ دھیان سے پکایا کرو۔ ادھر سالن پکا رہا ہے۔ ادھر پڑھائی ہو رہی ہے۔ بھلا یوں بھی کہیں پڑھائی ہوتی ہے۔ تو چچی جان۔ آپ خود پکایا کیجئے۔ تموتہ رہ سکی۔

”ہائے ہائے۔ لڑکی کے دیدوں میں تو ذرا بھی پانی نہیں رہا بات کر پھٹ سے جواب لے لو۔ رشیدہ بیگم آنکھیں کھمکتی ہوئی کہنے لگیں۔ ”ظلم کی بھی حد ہوتی ہے چچی۔ کام کو کوئی ہاتھ نہیں لگاتا۔ انصاف بھی کوئی چیز ہے۔ آپ مجھ پر بھی کوئی کام لگا دیں۔ اور کچھ مجھے پر۔ وہ تو ہاتھ نہیں لگاتی۔ تم تو آج ناہید کی نصیحت پر چلنے کی ٹھان چکی تھی۔

”بختہ کی تو تم دشمن ہو۔ اس کی ریس کرتی رہنا۔ اس کی جوتی کرتی ہے کام۔ تم کو کیا دیکھنے کے لئے لائی ہوں اس گھر میں۔ رشیدہ کا پارہ چڑھ گیا تھا۔“

”تویوں کہتے نا۔ تو کراچی بنا کر لائی ہوں۔ تم تو روہانسی ہو گئی۔“

”یہی سمجھ لو۔“

”پھر ٹھیک ہے۔ میں تو یہاں اپنا حق سمجھ ہوئے تھی۔“

”چپ رہ منحوس۔“ رشیدہ بیگم دانٹنے لگی۔

”خدا کے لئے چچی اماں، یہ لفظ نہ کہا کیجئے۔ یہ میں نہیں سن سکتی۔ وہ کالوں پر ماتہ رکھ کر کہنے لگی۔

”اے ہے۔ سن نہیں سکتی۔ اگر سننا نہیں چاہتی۔ تو کان کھول کر سن لے۔ یہ پڑھائی کا ڈھونڈ چھوڑ۔ اور سیدھی طرح کام کیا کرو۔“

”پڑھائی تو میں نہیں چھوڑ سکتی۔“

”دیکھ لوں گی۔“

”اُمّاں - خیمہ باہر کھڑی ہوئی چلائی۔“

”کیا ہے۔؟“

”وہ آپ کیوں اپنا مغز خراب کر رہی ہیں۔ آئیے۔“

”کیا کروں۔ تیرے آبا نے روز کی جھجک جھجک دے دی ہے مجھے۔“

شفیق الرحمن ہاتھ میں اخبار لئے اندر آئے۔ اپنا ذکر سن کر چونکے

”کیا ہے بیگم۔؟“

”اُجی۔ یہ آپ کی بھینچی نے تو ناک میں دم کر دیا ہے۔ زبان درا

ایسی ہے کہ اب کیا بتاؤں۔ رشیدہ بیگم چیخ اٹھیں

”تمو۔“

بچا کی بھاری آواز سن کر اُس کا جی کٹ گیا۔

”تمہیں اپنی چچی کا ادب کرنا چاہیئے۔“

تمو نے کوئی بات نہ کی۔ وہ اندر ہی اندر گھٹ کر رہ گئی۔

”سنا تم نے۔؟“ شفیق الرحمن دوبارہ بولے۔

وہ کچھ نہ بولی۔

شفیق الرحمن خوش ہو کر بولے۔

”بیگم۔ منصور پہنچ گئے ہیں۔“

”بیچ۔؟“ رشیدہ بیگم سب کچھ بھول کر شوہر کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

”ہاں۔ یہ تار بھی آیا ہے۔ اور خط بھی۔ اُنھوں نے حبیب سے

خط اور تار نکالا۔

”کیا لکھا ہے۔؟“

”منصور پہنچ گئے ہیں۔ کچھ دنوں بعد یہاں آئیں گے۔ مجھے لکھا

ہے کہ اُن کا تبادلہ بھی لاہور کے بڑے اسپتال میں ہوا ہے جلد ہی

آنا پڑے گا۔

”بیچ۔؟“ یہ تو بڑا اچھا ہوا۔“

خیمہ نے ایک بار پھر غور سے تمو کی طرف دیکھا۔ جو دیگچی میں چھپ

چلا رہی تھی۔

بیگم۔ منصور کے لئے کمرے صاف کرا دو۔

”ہاں۔ ہمارے گھر میں سفیدی وغیرہ کر دانی ہے۔ بس صبح سے

شروع کر دوں گی۔ وہ کمرہ منصور کے لئے ٹھیک رہے گا۔ ہاں

ہاں۔ تمو۔ کل کالج منت جانا۔ ذرا صفائی کرنی ہے۔ شفیق الرحمن

بولے۔

”اُچھا بچا جان۔ تمو طنز یہ بولی۔

شفیق! باہر نکل گئے۔ خیمہ اور رشیدہ عجیب عجیب سی باتیں

کر لے لگیں۔

کھانا دے کر تم کو پھر کام میں لگ گئی۔ جن کمروں میں سفیدی ہو چکی تھی وہ ان کے شیشے وغیرہ صاف کرنے لگی۔ گلو بالٹیوں سے پانی ڈالتا رہا۔ اور وہ فرش دھوتی رہی۔ آج نہ جانے رشیدہ بیگم کو کیا خیال آگیا۔ نجمہ کو ساتھ ملا کر وہ سامان اندر لے جانے لگی۔

اور تینوں نے مل کر سامان پھر سلیقے سے کمروں میں جمادیا۔ اب منصور کا کمرہ رہ گیا تھا۔ نجمہ اور رشیدہ بیگم تنگ گئی تھیں۔ رشیدہ بیگم پلنگ پر درازا ہوتے ہوئے کہنے لگیں۔
”اب منصور میاں کا کمرہ تو تمہو ہی سجادے“

تمو جل کر منصور کے ہونے والے کمرے کی طرف چلی گئی۔ ہلکے نیلے رنگ سے کمرہ خوب نکھر گیا تھا۔ چونے کی سوندھی سوندھی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ مگر تمو چڑ گئی تھی۔

منصور کیا آرہے ہیں۔ گویا واسرائے اُتر آئیں گے۔ وہ جھنجھلا اٹھی۔

فرش گولنے دھو دیا تھا۔ وہ بوری کے ٹکڑے سے فرش چمکانے لگی۔ کمرے سے منسلک غسل خانہ تھا۔ وہ رشیدہ بیگم خود ہی سیدٹ کر گئی تھیں۔ اور ضروری سامان رکھ گئی تھیں۔

تمو کڑھٹے ہوئے ہر چیز ترتیب سے جمادیا رہی تھی۔ ایک گھنٹے کی

(۹)

دوسرے دن صبح تمو کالج نہ جاسکی۔ اور حیرت کی بات تو یہ تھی کہ نجمہ بھی کالج نہ گئی تھی۔ بلکہ صبح دونوں ماں بیٹی ناشتے سے فارغ ہو کر بازار چلی گئیں تھیں۔ تمو کو ہدایت کر گئی تھیں کہ سامان وغیرہ باہر نکال دے۔

تمو نے گلو کے ساتھ مل کر بھاری بھر کم سامان نکالا۔ سفیدی مزدور آگئے تھے۔ وہ کمروں میں سفیدی کرنے لگے۔

تمو کھانا پکانے میں لگ گئی۔ دال کو بکھارتے ہوئے اُس کا تڑپ اٹھا۔ اب نئی مصیبت منصور صاحب تشریف لا رہے ہیں کام اور بڑھ جائے گا۔ اور میری پڑھائی بہت مشکل نظر آرہی ہے۔ اب بھی کون سے ڈھنگ سے ہو رہی ہے۔ دادی اماں کس کے سہارا چھوڑ گئیں مجھے۔ چچا بھی تو موم کے بنے ہوئے ہیں۔ وہ کڑھکتی رہے کچھ دیر بعد نجمہ اور رشیدہ لوٹ آئیں۔ وہ بہت سا سامان لائی تھیں۔ گلدان۔ ٹیبل لمپ۔ نئے پردے۔ تو لپٹے آئینہ وغیرہ وغیرہ۔

”بی بی جی۔ آپ بہت تھک گئی ہیں۔ چائے بنا لائیں؟“ گلو کو بھی
تمو پر رحم آ رہا تھا۔
”نہیں گلو۔“ ارے ابھی تک تو ہانڈی بھی نہیں چڑھائی۔ وہ مری
ہوئی آواز میں بولی۔

”رہنے دیں بی بی جی۔“ میں روٹیاں تنور سے لے آؤں گا۔“
”یہ کیسے ہو گا؟“

”بی بی جی۔ گلو کی آنکھوں میں آنسو آ گئے
”کیا ہوا گلو۔؟“ تمو کی آواز کانپ رہی تھی۔
”آپ۔ آپ۔ کتنا کام کرتی ہیں۔“
وہ غم ناک سی ہنسی ہنس دی۔ اور پھر بولی،
”تو کیا ہوا گلو۔؟“

”نہیں بی بی جی۔ میں آپ کا سارا کام کر دیا کروں گا۔“
”پنگے۔ تم ابھی اتنے چھوٹے ہو۔ سمجھ نہیں سکتے۔“
”میں سب سمجھتا ہوں بی بی جی۔“
”تم بھی تو کام کرتے ہو سارا دن۔“

”میرا کیا ہے بی بی جی۔ میں تو کمزور ہوں۔ اور میرے ماں باپ بھی نہیں
ہیں۔ تمو نے نیلے اختیار گلو کو گلے لگا لیا۔ وہ سسکیاں پھرنے لگا۔

محنت کے بعد اُس نے بھرپور نظر ڈالی۔ تو وہ حیران رہ گئی۔ کمرہ
بے حد خوبصورت لگ رہا تھا۔ نیلی دری۔ دو کرسیاں۔ ساتھ ہی
ایک گول میز۔ جس پر نیلا ہی ٹیبل کور بھیلایا گیا تھا۔ پلنگ پر نیلا
بیڈ کورڈین کو سکون دے رہا تھا۔

کھڑکی کا پردہ ٹھیک کر کے اُس نے باہر دیکھا۔ چنبیلی کی سیلیں
کھڑکی کو چھپانے کی ناکام کوشش کر رہی تھیں۔ اور ان کی بھیننی بھیننی
خوشبو مدھوش کر رہی تھی۔

تمو کا دل چاہا کہ وہ یہاں پر لیٹ جائے۔ کاش اُس کا کمرہ بھی
ایسا ہوتا جہاں چنبیلی کی خوشبو اُسے مدھوش بنا دیا کرتی۔ اور وہ اس
کھڑکی میں کھڑی ہو کر ان کیاریوں کو دیکھا کرتی۔ مگر اس کے کمرے کی
کھڑکی تو ڈیوڑھی کی عجیب و غریب سیم زدہ دیوار نے روک رکھا تھا۔
منیٹل پیس پر ٹائم پیس اور وہ چھوٹا سا جہاز جو آج ہی تجربہ لائی تھی
سجا کر وہ پھر کھو گئی۔ کمرہ سیٹ ہو چکا تھا مگر تمو تھک کر چور ہو گئی تھی۔
آخری نظر ڈال کر وہ اپنے کمرے میں آ گئی۔ جہاں پر چونا کر دانے کا کسی کو
خیال نہ آیا تھا۔ وہ پلنگ پر دھم سے گر گئی۔

”بی بی جی۔؟“ گلو پاس کھڑا جانے کب سے اُسے گھور رہا تھا۔
”کب ہے گلو۔؟“ وہ چونک کر اٹھ بیٹھی۔

وہ خود بھی رونے لگا۔ ہاں گلو جن کے ماں باپ مرتے ہیں۔ وہ بے سہا ہو جاتے ہیں۔ وہ نوکر ہی بن جاتے ہیں۔ تم بھی نوکر ہو میں بھی نوکر! چلو چل کر کام کریں۔ ورنہ مالکن بگڑیں گی۔ چلو۔ ۹۔ اور گلو چند باقی تم کو دیکھتا رہا۔ مگر وہ تیز تیز قدموں سے باورچی خانے کی طرف جا چکی تھی۔

(۱۰)

آج منصور پہنچ رہے تھے۔ گھر میں عجیب بھاگ دوڑ مچی ہوئی تھی۔ تموتین دن سے کالج نہ جاسکی تھی۔

نجمہ تیز جامنی رنگ کی ساڑھی پہن کر بار بار بال درست کر رہی تھی۔ شفیع الرحمن اسٹیشن جا چکے تھے۔ ہلکا ہلکا میک اپ بھی نجمہ کے کھڑے چہرے کو دلکش نہ بنا سکا تھا۔ اور رشیدہ بیگم تو بس تموتے کے گرد بھگتی تھیں۔ دیکھنا تموتے۔ شامی کباب اچھے بنانا۔ منصور میاں کو بہت پسند ہیں۔ اور ہاں تموتے۔ پلاؤ کو تو دیکھو۔ کہیں چاول رسیلے نہ ہو جائیں۔

ذرا جلدی ہاتھ چلاؤ نا۔ گیارہ بج رہے ہیں۔ ایک انگلیٹھی اور جلاؤ۔ اس سے تو کام نہیں بن رہا۔ جلدی کرو۔

اور تموتے اسان سچی چچی کا کہنا مان رہی تھی۔ اس کا ہاتھ بھی جل گیا تھا۔ ہاتھ میں جلن ہو رہی تھی۔ جسے وہ بار بار ٹھنڈے پانی میں بھگوتی۔ گلو اس کی برابر مدد کرتا تھا۔

پورے گھر میں منصور منصور ہو رہا تھا۔

اور وہ میلی قمیض کے پھٹے ہوئے کفوں سے آنکھیں صاف کرتا ہوا
باہر بھاگ آیا۔

اگلے لمحے شفیق الرحمن منصور کو لئے ہوئے اندر آئے۔
رشیدہ بیگم دوڑ کر لیٹ گئیں۔
”میرا بیٹا۔ میرا لال۔“
منصور ہنستے ہوئے بولے۔

”خالہ جان تو بالکل ویسی ہی ہیں۔ ذرا بھی نہیں بدلیں۔“
”اے بیٹا۔ میں کیوں بدلوں۔ اللہ نہ کرے۔ تمہاری امی اور
ناہیدہ کیسی ہیں۔“

”ٹھیک ہیں۔ کہہ رہی تھیں۔ کچھ دن اور رک جاؤ۔“
نجمہ چینیلی کی میل کے پاس شرم سے یونہی بل کھا رہی تھی۔ اچانک
منصور کی نظر نجمہ پر پڑی۔

”ارے۔ نجمہ ہیں۔ مگر وہاں کیوں کھڑی ہیں۔“ وہ زور سے ہنستے۔
”او بیٹی۔ وہاں کیوں کھڑی ہو۔“ شفیق الرحمن بولے۔
”تم تو سٹھیا گئے ہو۔ شرماتی ہے۔“ رشیدہ بیگم ہنسنے لگیں۔
”مجھ سے شرماتی ہے خالہ جان۔“ ادھر آنسو کی پچی۔ منصور
ہنستے ہوئے اُس کی طرف بڑھے۔

اور کچھ سوچ رہی تھی۔ منصور نہ ہوا۔ قیامت ہی آگئی۔ آج نواب صاحب
آ رہے ہیں۔ تو یہ حال ہے۔ جب وہ یہاں رہیں گے تو کیا ہوگا۔

”اماں۔ نجمہ رستہ واضح پر نظر ڈالتے ہوئے بولی۔
”تم بھی کپڑے بدل لو۔“
”ہاں بیٹی۔ کیا کروں، سب کاموں کی دیکھ بھال بھی تو مجھے ہی کرنی
پڑتی ہے۔“

”اماں۔ گاڑی نواب آگئی ہوگی۔ کپڑے بدل ہی لو۔“
”ہاں۔ جا رہی ہوں۔“

نجمہ چینیلی کی میل کے پاس کھڑی باہر کے دروازے کو دیکھ رہی تھی۔
بادرچی خانے میں ڈھیر سا رادھواں بھر گیا تھا۔ تم کو سانس آئے لگے۔
”اللہ۔ یہ دھواں تو ہٹاؤ۔ کیا گنواروں کا گھر معلوم ہوتا ہے۔ نجمہ چینی۔
واہ بیگم صاحبہ۔ گلو آہستہ سے بڑھایا۔

اور تم کو کے لبوں پر طنز پر مسکراہٹ پھیل گئی۔
”کچھ ہی دیر بعد باہر تانگہ آکر رکا۔ نجمہ کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں
رشیدہ بیگم دوپٹہ ٹھیک کرتی ہوئی باہر دوڑ آئیں۔
تم کو کا ہاتھ دوبارہ چل گیا۔ اور گلو کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔
”اے گلو۔ جا باہر۔ سامان وغیرہ اندر لانا ہوگا۔“

نجمہ بھاگنے لگی۔ مگر منصور سامنے کھڑے ہو گئے۔

”ہاں تو۔ کیوں بھاگ رہی ہو تم سے۔ بتاؤ۔“

نجمہ کا رنگ سرخ ہو گیا۔ اور ماتھے پر ہاتھ لے جاتے ہوئے بولی۔

”آداب۔!“

”جیتی رہو۔“ منصور زور سے ہنسنے لگے۔

قریب کھڑے ہوئے شفیق الرحمن اور رشیدہ بھی زور سے ہنسنے لگے۔

ہنسی کا ایک طوفان آگیا۔ اور پھر اس طوفان کے ساتھ ہی منصور

ڈرائنگ روم میں داخل ہو گئے۔ نجمہ بھی ساتھ تھی۔ رشیدہ بیگم گھر کے

حالات پوچھنے لگیں۔

گلو سامان رکھ کر ڈرائنگ روم میں آیا۔

سامان رکھ دیا ہے۔

”اچھا جا۔ نموسے کہہ، سکوائش بنادے۔ رشیدہ بیگم نے کہا۔

گلو تقوڑی دیر بعد سکوائش بنا لایا۔ جگ اور گلاس ٹرے میں سلیقے

کے ساتھ رکھے تھے۔ وہ ٹرے نجمہ کو تھا کر واپس چلا گیا۔

”خالہ جان۔ تم کو کہاں ہے۔“ مجھے ناہید اور اجی نے بتایا تھا۔

منصور کہنے لگے۔

وہ۔ وہ۔ باورچی خانے میں ہے۔ رشیدہ بیگم کی تیوری پر بل لگے۔

ناہید نے اُن کے لئے کچھ چیزیں بھیجی ہیں۔ منصور خوش اخلاقی کا مظاہرہ

کرتے ہوئے گویا ہوئے۔

”ابھی تو تھکے ہو۔ آرام کرو۔ دیکھی جائے گی چیزوں کی بھی، نجمہ نے

گلاس منصور کو فہمایا۔ تو وہ شریر نظروں سے اُسے دیکھنے لگے۔ اور نجمہ کا

موجودہ متو کے نام پر ذرا اکڑ گیا تھا اب ٹھیک ہو گیا۔

”بیٹا۔ ابھی تم اپنے کمرے میں چلو۔ سفر سے آئے ہو۔

نہا لو۔ پھر۔ پوچھیں گے تمہارے پانچ سالہ سفر کا حال۔

”اے ابھی کیا جلدی ہے۔ دو چار دن آرام تو کرے۔

رشیدہ بیگم نے ٹوکا۔

”گلو۔ صاحب کو کمرہ دکھاؤ۔“

گلو منصور کو لے کر اُس کا کمرہ دکھانے چل پڑا۔ منصور کا سامان

کمرے میں پہنچ چکا تھا۔ وہ کمرے کو ذرا حیرت سے دیکھنے لگا۔ اور

پھر اُسے نجمہ کی کارستانی معلوم ہوئی۔

نجمہ کے متعلق اس نے کچھ عجیب و غریب تصور اپنے ذہن میں

باندھے ہوئے تھے۔ مگر نجمہ کو دیکھ کر اسے مایوسی ہوئی تھی۔ لیکن

چونکہ وہ اس سے منسوب تھی۔ اس لئے وہ اُسے اچھی معلوم ہوئی۔

مگر کوئی خاص اثر نہ ہوا تھا اُس پر۔

منصور شکل و صورت میں ناہمید سے بھی چار ہاتھ آگے تھے۔
 رنگ اتنا سفید نہ تھا۔ بہت زیادہ سا تو لا بھی نہ تھا۔ چہرے کے
 نقش بے حد نمکین اور پرکشش تھے۔ قد بڑا بھرپور جسم۔ اور
 جدید طرز کے کپڑے تو اُسے بے حد مہیڈ سم بنائے ہوئے تھے۔
 قراخ پشانی پر خشک بکھرے ہوئے بالوں کو لنگھی کرتے ہوئے
 اُسے میگی یاد آگئی۔

— جوں لندن میں اس سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ نیلی آنکھوں والی میگی
 مگر۔ میگی کو اس نے دوست ضرور بنایا تھا۔ اُس کے ساتھ سیر
 تفریح کرتا تھا۔ لیکن شادی کے لئے اُس نے صاف کہہ دیا تھا۔
 تمہو نے کھانا چن دیا۔ سالن کے ڈونگے رکھ کر اُس کے دسترخوان
 کا جائزہ لیا۔ سب چیزیں موجود تھیں۔ وہ گلو کو کہہ کر واپس باورچی خانے
 لوٹ گئی۔ گلو نے سب کو اطلاع دے دی۔

منصور نہا چکے تھے۔ اس وقت وہ سفید لٹل کے کرتے اور سفید
 پاجامے میں ملبوس تھے۔ بچہ شفیق الرحمن اور رشیدہ بیگم دسترخوان
 پر بیٹھ چکے تھے۔ گلو کی رہبری میں منصور بھی آگئے۔
 کھانا شروع ہو گیا۔

شفیق الرحمن شامی کیاب کھاتے ہوئے بولے۔

تمو کھانا خوب پکاتی ہے۔

تمو کے نام پر منصور پھر چونکے۔

”کیا وہ کھانا نہیں کھا میں گی۔“ انھوں نے پوچھا۔

”وہ وہیں کھالے گی۔“ رشیدہ بیگم قہر کی نظر میں شوہر پر ڈالتے ہوئے بولیں۔
 کھانا واقعی بہت مزے کا ہے۔ اب کے منصور بولے۔

رشیدہ بیگم جل ہی تو گئیں۔ حالانکہ انھوں نے سبوتج رکھا تھا کہ وہ
 منصور سے یہ ہی کہیں گی کہ کھانا بچہ نے پکایا ہے۔

مگر شفیق الرحمن بے چارے سیدھے سادھے انسان تھے۔ وہ کیا
 جانتے تھے کہ بیگم نے کیا سوچ رکھا ہے۔

باتیں بھی ہوتی رہیں۔ کھانا بھی ہوتا رہا۔

کھانے سے فارغ ہو کر منصور اپنے کمرے میں چلے گئے۔ کھڑکی کے
 پاس کھڑے ہو کر چینیسی کی خوشبو محسوس کر کے وہ ان کیاریوں کو دیکھنے لگے۔
 اور پھر کتنی دیر تک کھڑے وہاں سگریٹ پیتے رہے۔

تمو کھانا زہر مار کر کے اپنے کمرے میں آگئی۔ اس نے طے کر لیا کہ
 کل سے کالج جائے گی۔

اس لئے وہ دوسرے روز کے لئے اپنے کپڑے وغیرہ ٹھیک کرنے لگی۔
 گلو برتن صاف کرتے ہوئے فلمی گانا گاربا گھانا اور باقی لوگ سوتے

کے لئے اپنے اپنے کمروں میں جا چکے تھے۔

منصور بھی پلنگ پر بیٹے نجمہ کے متعلق سوچ رہے تھے۔ کیا نجمہ
زندگی کی غمگسار ساتھی بن سکے گی؟

ہاں۔

کیا ہوا۔ اگر وہ خوبصورت نہیں۔ خوب سیرت تو ہے۔ اور
پانچ سال پہلے کی منگنی۔

وہ مسکرا دیا۔ مگر اس مسکراہٹ میں دلی خوشی نہیں تھی۔

(۱۱)

منصور کو آئے تین دن گزر چکے تھے۔ مگر اب تک تموان کے سامنے نہ گئی
تھی۔ اس عرصے میں نجمہ کی قربت منصور پر اچھا اثر کر رہی تھی۔

چونکہ منصور کی تقرری سرکاری اسپتال میں ہوئی تھی۔ اس لئے انھوں نے
چارچ لے لیا تھا۔ اور اگلی صبح وہ باقاعدہ ڈیوٹی پر جانے والے تھے۔

تو تین دن سے باقاعدہ کالج جا رہی تھی۔ البتہ نجمہ چھٹی پر تھی۔

چونکہ تموان کالج سے دو بجے واپس آنے لگی تھی۔ اس لئے رشیدہ بیگم کو خود
دوپہر کا کھانا وغیرہ پکانا پڑتا تھا۔ تموان نے کہہ دیا تھا کہ اس کے پریکٹیکل ہو رہے
ہیں۔ اس عرصے میں وہ کالج کی لائبریری میں بیٹھی اسٹیڈی کرتی رہتی ہے۔
گھر آکر وہ کچھ دیر آرام کرتی اور پھر رات کا کھانا وغیرہ پکانے میں لگ جاتی۔
شام کا دھندلا سا تھا۔ گھر کے تمام افراد باہر صحن میں بیٹھے تھے منصور
بھی باہر بیٹھے اپنی دلچسپ باتوں سے سب کو محظوظ کر رہے تھے۔

تموان نے اس عرصے میں منصور کی شخصیت کو جان لیا تھا۔ حالانکہ وہ ایک
مترہ بھی اُس کے سامنے نہ گئی تھی۔ البتہ منصور کو اُس نے دروازے کی اوٹ

سے ضروری دیکھا تھا۔ اُسے نجمہ کی قسمت پر رشک بھی آیا تھا۔

یہ ایک منصور نے پوچھ لیا۔

خالہ جان۔ وہ۔ ناہید نے تم کو کے لئے کچھ چیزیں بھی تھیں، وہ کہاں پر ہیں وہ چیزیں تم مجھے دے دو۔ میں دے دوں گی۔ شاید وہ تم سے پردہ کرتی ہے۔ رشیدہ بیگم فوراً بولیں۔

”اچھا۔ میں ابھی لا دیتا ہوں منصور اٹھ کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔

تھوڑی دیر بعد جب وہ واپس آئے تو ان کے ہاتھ میں ایک نیکیٹ تھا ”یہ لیجئے۔“

”گلو جاؤ۔ یہ چیزیں تم کو دے آؤ۔ رشیدہ بیگم نے گلو کو بکارا۔

گلو نیکیٹ لے کر باورچی خانے میں آگیا۔ منو نے نیکیٹ کھولا تو اس میں ایک بہت خوبصورت کتاب، ایک رائٹنگ پیڈ اور ایک قلم تھا۔

تمو کا دل ناہید کی محبت سے ایک ٹھنڈک سی محسوس کرنے لگا۔ اُسے یوں لگا جیسے جلتے ہوئے انگاروں پر کسی نے پانی کا چھینٹا دے دیا ہو وہ کتاب کو دیکھتی رہی۔

نہ جانے منصور نے کیا پروگرام طے کر لیا۔ کہ رشیدہ بیگم دودھ پانی ہوتی آئیں اور تم سے کہنے لگیں۔

ہم لوگ منصور میاں کے ساتھ نمائش دیکھنے جا رہے ہیں دیر سے آئیں گے۔

سونامنت۔ اور کھانا گرم رکھنا۔ اچھا۔“

تمو خاموش کتاب کی طرف دیکھتی رہی۔

نجمہ اور رشیدہ بیگم تیار ہونے لگیں۔ نجمہ تیز گلابی ساڑھی میں سیٹھی کا اشتہار معلوم ہو رہی تھیں۔

جب وہ تیار ہو کر نکلیں۔ تو شفیق الرحمن بولے۔

”تمو کو بھی لے جاؤ۔“

”وہ کہاں جائے گی۔ رشیدہ بیگم نے شوہر کو گھورا۔

منصور سیاہ سوٹ میں بہت وجہیہ لگا رہے تھے۔ اور نجمہ انھیں دیکھ دیکھ شراہی تھی۔ منصور نجمہ کو دیکھ کر بولے۔

”ہلکے رنگ کے کپڑے نہیں ہیں۔ تمہارے پاس۔“

”ہیں تو۔“

”تو ہی پہن لینی۔“

”اب کون بار بار پہنے گا۔ وہ اٹھلا کر کہنے لگی۔

”تمہاری مرضی۔“

وہ سب نمائش چلے گئے۔ شفیق الرحمن اپنے ملنے والوں کے ساتھ چلے گئے۔

نجمہ باہر صحن میں آبیٹھی۔ تخت پوش پر بیٹھ کر وہ ناہید کی بھیجی ہوئی کتاب میں کھو گئی۔

گلو چار پائیاں بچھا بچھا کر بستر لگا تا رہا۔ جب سے منصور آئے تھے۔ چولہے میں آگ ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ تمورا کھکھ کو کرید کرید کر انکارے برآمدے میں سونے لگی تھی۔

رات آہستہ آہستہ پھیلنے جاری تھی۔ تمور کتاب میں غرق تھی۔ اور چوکے کے پر بیٹھی ہوئی چچا کے انتظار میں کڑھنے لگی۔ گلو کو اس نے سونے اور بچہ کئی گھنٹے بیت گئے۔ دروازے پر کھٹکے کی آواز ہوئی۔ وہ چونکی۔

گلو برآمدے کے سفون کے پاس اونگھ رہا تھا۔ وہ اٹھ کر باورچی خانے میں چلی۔ رشیدہ بیگم اور نجمہ ہنستی ہوئی آئیں۔ منصور وہیں تخت پوش پر بیٹھ کر آثار نے لگے شفیق الرحمن نہیں آئے تھے۔

رشیدہ بیگم باورچی خانے کی طرف آکر بولی۔ کھایا تو بہت کچھ ہے۔ پھر تھوڑا بہت کھالیں۔ شاید منصور کو بھوک ہو۔ تم کھانا نکالو۔

تمو جل ہی تو گئی۔ مگر چپ چاپ کھانا نکالنے لگی۔ گلو کھانا تخت پوش لے گیا۔ وہ سب وہیں بیٹھ کر کھانے لگے۔

تمو اپنے لئے پلیٹ میں سالن ڈال کر بیٹھی ہی تھی کہ گلو آگیا۔ تب برتن سمیٹنے لگی۔ اور گلو کو کھانا دے کر آہستہ آہستہ نوائے توڑنے لگی۔

باہر سے آوازیں آتا بند ہو گئی تھیں۔ شاید وہ لوگ سونے کی تیاری کے بیگ سے گولی لے کر پانی کی تلاش میں برآمدے کی طرف آئے۔ باورچی خانے کھانا کھا کر وہ برتن وغیرہ صاف کرنے لگی۔ بارہ تو پہلے ہی بج چکے تھے لائی جلتی دیکھ کر وہ اس طرف پانی کے لئے آ نکلی۔ لیکن جونہی دروازہ اور ابھی تک چچا بھی نہیں آئے تھے اسے چچا کو کھانا کھلاتا تھا۔ برتن صاف میں قدم رکھا۔ وہ چونک پڑے۔

”یہ کون؟“

کرتے کرتے آدھ گھنٹہ گزر گیا۔

روپ اور بھی پسند آیا۔

”وہ۔۔۔ تم دو پتھر سر پر اچھی طرح اوڑھ کر جلدی سے الماری کی طرف بڑھی اور شیشے کا گلاس نکال کر باہر نکلی۔ گھڑے سے پانی ڈالتے ہوئے اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ اور پھر اس نے نیچی نظروں سے گلاس منصور کے آگے کر دیا۔

”شکریہ، منصور گلاس پکڑتے ہوئے اس کے کانپتے ہوئے ہاتھوں کو دیکھ کر مسکراتے لگے۔

”تمو حیران تھی کہ کیا کرے۔ وہ گھبرا کر جانے لگی۔ کہ منصور نے پھر پکارا۔

”سینے۔۔۔“

”وہ کھڑی ہو گئی۔“

”آپ۔۔۔ میرا مطلب ہے۔ اس وقت یہاں۔۔۔“

”جی۔۔۔ وہ۔۔۔ میں دراصل چچا میاں کا انتظار کر رہی تھی۔!“

”لو کیا۔ اور کوئی یہ کام نہیں کر سکتا۔“

”جی۔۔۔“ تمو سو گوارسی ہو گئی۔

منصور اس کی کیفیت سمجھ گئے۔ اور بات کا اثر دور کرنے کے لئے فوراً بولے۔

”ناہید اور اُتی آپ کو بہت یاد کرتی ہیں۔

تمو چو کے پر بیٹھ بیٹھ سو گئی تھی۔ اس کی گود میں ناہید کی بھیجی ہوئی کتاب کھلی پڑی تھی۔ بال بے ترتیب سے تھے۔ بلکے سے پکڑوں میں وہ بے خبر سوئی ہوا منصور چند لمحے گم سم کھڑے رہے۔ پھر ان کے دل میں ہمدردی کی ایک اٹھی۔ تو یہ ہے تمو۔

سوئی سوئی آنکھیں، جن کے حسن کو ملکوں کی خوبصورت جہاں نے چھپایا ہوا تھا۔ زردی مائل سفید سی زنجبت والی تمو۔

وہ کافی دیر اُسے دیکھتے رہے۔ انھیں سوتی ہوئی تمو بڑی اچھی لگ رہی تھی۔ اور اسی لئے وہ گولی ہاتھ میں لئے اُسے دیکھتے رہے۔

اور پھر اسی لمحے منصور کا پیرلیٹ سے ٹکرا گیا۔ تمو چونک کر اٹھی۔ اس نے سامنے دیکھے بغیر کہا۔

”بڑی دیر کر دی چچا میاں آپ نے۔ کھانا باہر لاؤں کیا۔ منصور کچھ حیرت سے اسے دیکھ رہے تھے۔ وہ سمجھ گئے۔ کہ تمو چچا کا انتظار کر رہی ہے اتنی رات تک۔

اپنی بات کا جواب نہ پا کر تمو نے سامنے دیکھا۔ منصور کو وہاں کھڑا دیکھ وہ برہمی طرح گھبراتے۔

”آپ۔۔۔“

جی۔۔۔ وہ۔۔۔ میں پانی لینے آیا تھا۔ منصور کو اس کا گھبراہٹ ہوا۔

”کیسی ٹھنسیں وہ۔“ تمہو کی آواز شرم میں ڈوبی ہوئی تھی۔
 ”اچھی ٹھنسیں۔“

”اُسی لمحے شفیق الرحمن کھانسنے“

”ارے۔ چچا میاں تو آگئے ہیں۔“ نمونے کہا۔

اور آپ خواہ مخواہ انتظار کر رہی تھیں۔ منصور نے فوراً کہا۔

”وہ تو میری عادت بن چکی ہے۔ تمہو کی آواز جذباتی ہو گئی۔ اور اسی لمحے وہ تیز قدم اٹھاتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف چلی گئی منصور کچھ دیر اُسے جانا ہوا دیکھتے رہے اور پھر اپنے پلنگ پر آگئے۔“ ”تو یہ تھی نمونہ“ مگر خالہ جان شاید انھیں اچھا نہیں سمجھتی۔ اور گھر میں بھی کبھی نہیں دیکھا۔ شاید سارا دن کام کرتی رہتی ہے۔ اتنے دن ہو گئے۔ مجھے آئے ہوئے۔ مگر میں نے اُسے آج، اور وہ بھی کس طرح۔ ورنہ شاید میں کبھی نہ دیکھ سکتا۔ اور پھر کتنی دیر تک انھیں میندہ آئی۔

”تمہو ان کے سامنے رہی۔ اور نہ جانے کب اُن کی آنکھ لگی۔“

(۱۲)

صبح تنہواٹھی۔ تو چچی نے طوفان مچایا ہوا تھا۔ ساری رات باورچی خانے کی لائٹ جلتی رہی۔ میں کہنتی ہوں۔ کچھ ہوش سے رہا کرو۔

وہ چپ ہو کر گذر گئی۔ باورچی خانے میں بیٹھ کر ناشتہ تیار کرنے لگی۔ چچی بولتی رہی۔

منصور صبح صبح اٹھ کر باہر چلے جاتے تھے۔ وہ واپس آئے تو خالہ کو بولتے دیکھ کر کہنے لگے۔

”در کیا بات ہے خالہ جان۔“

بیٹے۔ بات تو کچھ نہیں۔ ساری رات باورچی خانے کی لائٹ جلتی رہی ہے۔

”وہ۔ وہ تو خالہ جان مجھ سے کو تا ہی ہو گئی۔ میں پانی پینے اٹھا۔ لائٹ جلائی۔ اور پھر نند کرنا بھول گیا منصور فہم نہ لگا کر بولے۔

”اچھا۔ رشیدہ شرمندہ ہونے والی تو ٹھنسیں نہیں۔ ہنسنے لگیں۔ اور باورچی خانے میں بیٹھی ہوئی نموجیران سی ہو گئی۔“

”بھلا اس جھوٹ کی ضرورت ہے۔“

ناشتہ تیار کر کے وہ باہر نکلی۔ منصور جنیل کی بیل کے پاس کھڑے تھے
ریشہ بیگم بھی پاس ہی کھڑی تھیں۔

وہ جلدی سے گذر گئی۔ ریشہ بیگم نے جب دیکھا کہ منصور اسی کو
صرف دیکھ رہے ہیں۔ تو فوراً بولیں۔

”یہی ہے نمو۔!“

”اچھا یہ ہیں۔ منصور مصنوعی حیرت سے کہنے لگے۔

”ہاں۔ بڑی سفر قدم ہے بیٹا۔ ریشہ بیگم سرگوشی کے لہجے میں
کہنے لگیں۔

”کیا مطلب ہے؟ منصور چونک گئے۔

”ہاں۔ بڑی سٹخوس ہے۔ اللہ اس کے سائے سے دشمن کو بھی بچائے۔

تم تو جانتے ہو۔ تمہارے خالو کے چھوٹے بھائی رفیق۔ جب یہ کلہو پی پیدا
ہی نہ ہوئی تھی۔ جوان ہی دنیا سے اٹھ گئے۔ پیدائش پر ماں کو ہضم کیا۔ اور پھر
اس کی وجہ سے وہ بڑھیا نے بھی بڑے دکھ جھیلے۔ اب ہمارے پتے بڑ گئی ہے۔

میں نے تو کئی جگہ سے تعویذ منگو کر رکھ چھوڑے ہیں۔ ایک تعویذ تو بخیر کے

لاکھ میں لگوا دیا ہے۔ یہ فیشن ایبل لڑکیاں تو تعویذ پہنتی ہی نہیں اسی

لئے تو ایسے کیا ہے۔ اللہ رحم کرے۔ ریشہ بے لگان بولے جا رہی تھی۔

اور منصور اس کی باتیں سن سنی کر خود دنا مت سے کھڑے جا رہے تھے۔

”اُف اتنے پست خیالات کی مالک ہیں، یہ خالہ اور نجمہ۔“

اُسی لمحے نجمہ کالج کے لئے تیار ہو کر آگئی۔ امی چلیے۔ ناشتہ کر لیں۔ میرا
نانکہ آئے والا ہے۔

منصور کھوٹے کھوٹے سے ماں بیٹی کے ساتھ کمرے میں آ گئے۔

تمو سلیقے سے ناشتہ لگا چکی تھی۔ گلو گرم چائے لے آیا۔

نجمہ اور ریشہ باتیں کرتی رہیں۔ مگر منصور خاموشی سے چائے پیئے رہے۔
”اُس انڈے میں دیکھیے۔ نمک کتنا تیز ہے۔ نجمہ پلیٹ ایک طرف
رکھتے ہوئے کہنے لگی۔

”نہ جانے دھیان کہاں رہتا ہے اہں کا۔ ریشہ بیگم بولیں۔“
منصور دونوں کی طرف دیکھ کر رہ گئے۔

”آج آپ کس وقت آئیں گے۔“ نجمہ نے منصور سے پوچھا۔
”کیوں؟“

”بس یونہی۔“

”کسی وقت آہی جاؤں گا۔“ منصور بے دلی سے بولے۔

”آخر کس وقت؟“ نجمہ ہنس پڑی۔

”دونکے تک۔“

”اچھا۔“

”بات کیا ہے۔ آخر۔؟ رشیدہ ہنس کر نجمہ سے پوچھنے لگی۔

”وہ۔ اُمّی۔ آج کچھ بہت اچھی لگی ہے۔ نجمہ اٹھلا کر بولی۔“

اچھا۔ اچھا۔ دکھلائے گا۔ چلی جانا شام کو۔ رشیدہ نے جواب دیا۔
ناشتے کے بعد سب باہر نکل آئے۔

”اُمّی۔ میرا تانگہ آگیا۔ دروازے پر دستک سن کر نجمہ جلدی جلدی
برقعے کے بٹن بند کرنے لگی۔

نجمہ سلام کر کے کتابیں منہجالتی ہوئی باہر نکل گئی۔ اور پھر تھوڑی
دیر بعد جب نمونہ برقعہ اوڑھے باہر نکلی تو منصور بھی تیار ہو کر باہر آئے۔
وہ اُسے یوں جاتا دیکھ کر پوچھنے لگے۔

”کیا آپ تانگے پر نہیں جاتیں؟“

”جی۔ نہیں۔“

”کیوں۔؟“

”ہر بات کا جواب دینا ضروری ہے کیا۔؟ تو چڑ گئی۔ اور منصور ہلکا ہوا

ہو گئے۔ وہ وہیں کھڑے اُسے دیکھتے رہے۔ جو تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی
گلی کے موڑ پر گم ہو چکی تھی۔

منصور جب اسپتال پہنچے تو پھر بھی اُن کا دھیان تمویں اٹکا ہوا تھا۔

”یہ لڑکی اتنی بے زار کیوں ہے۔؟“

”وہ اُس کی شخصیت میں نہ جانے کیوں اتنے اُلجھے ہوئے تھے۔ حالانکہ
اچھی سے اچھی لڑکیاں اُن کی نظر سے گزری تھیں۔ مگر نہ جانے اُداس سی
آنکھوں والی تمواٹھیں کیوں سوچنے پر مجبور کر رہی تھی۔

آج اسپتال میں ان کا پہلا دن تھا۔ سرجن نے ان کی ڈیوٹی E-N-T
میں لگائی تھی۔

وہ مریضوں کو دیکھتے رہے۔ ناک، کان، گلا اور بے شمار سننے لکھنے کئے۔
اور پھر E-N-T وارڈ کا راولڈ لے کر وہ وقت سے پہلے ہی لوٹ آئے۔

ایک بجا تھا۔ رشیدہ میگم گلوپر برس رہی تھیں۔ وہ اپنے کمرے میں چلے گئے۔
کمرے میں بیٹھ کر انھوں نے ناہید اور ارامی کو خط لکھا۔ سارے گھر کا ذکر کرتے
ہوئے نہ جانے ان کا جی چاہنے لگا۔ کہ منو کا ذکر بھی کیا جائے۔ اور پھر انھوں
نے ناہید کے خط میں لکھ ہی دیا۔ تو صاحبہ کو بھی دیکھا۔ میں محسوس کر رہا
ہوں۔ وہ ایک مظلوم سی لڑکی ہے۔ سارے گھر سے نہ جانے کیوں الگ الگ
رہتی ہے۔ تم کو کے بازے میں انھوں نے صرف یہی لکھا۔

کپڑے بدل کر وہ باہر نکل آئے۔ دھوپ بہت تیز تھی۔ رشیدہ اُسے
دیکھ کر بولیں۔

”بیٹا۔“ بیٹھک کا نیکھا کھول لو۔

اچھا خالہ جان۔ مگر وہ وہیں کھڑے رہے۔

”تم نے کہا نا۔ کہ پیدل چل کر آئے والے مر جاتے ہیں۔ وہ اسے گھورتے لگے۔

”ہاں۔ اور۔ سنیے۔ آپ تو مذاق کرتے ہیں۔

نجمہ شرمندگی میں کوئی بات نہ بنا سکی۔

کھانے پر بھی نموسے ملاقات نہ ہوئی۔ وہ تو اپنی جگہ اس گھر میں پہلے ہی سمجھ چکی تھی۔ اس لئے وہ گھر کو کھانا دے کر باورچی خانے میں ہی بیٹھ کر کھایا کرتی۔ آج اس کی ڈیٹ شیفٹ آگئی تھی۔ اور دسویں دن اس کے امتحان شروع ہو رہے تھے۔

کھانا کھا کر وہ اپنے کمرے میں آگئی۔ پلنگ پر لیٹ کر اس نے کتاب کھولی۔ لیکن آج اس کا ذہن اس قدر منتشر تھا کہ کتاب کے لفظ اس کے سامنے نایب رہے تھے۔

اس نے منصور کو کیسا سخت جواب دیا تھا۔

”وہ کیا خیال کرتے ہوں گے۔ انھوں نے تو مجھ سے ہمدردی کی تھی۔ اور یہ کم بخت۔ کہتے ہوں گے۔ بہت بدتمیز لڑکی ہے۔ مجھے ان سے ضرور معافی مانگا۔ یعنی چاہیے۔ اور پھر اُسے یوں محسوس ہوا جیسے کتاب کے صفحوں پر لکھا ہے۔ تمہو۔ کیوں چنگاری کو ہوا دیتی ہو۔ اچھا ہے اُسے بھی۔

تم سے نفرت ہو جائے۔ یگی یہ ہمدردی تجھے ہتھی پڑے گی۔ پیپہ

تجھ کا ناکہ باہر آکر رکا۔ وہ اندر آئی۔ تو رشیدہ بھی باہر نکل آئیں۔

”اے ہے۔ کتنی گرمی ہو گئی ہے۔ گال تو دیکھو، کیسے تھمتائے ہوئے ہیں۔ چلو جلدی سے منہ ہاتھ دھو لو۔ گلابی بی کے لئے شربت بنا لا۔ نجمہ منصور کو دیکھ کر بولی۔

”آپ تو دو بجے کا کہہ گئے تھے۔“

جلدی ہی آگیا۔ منصور مسکرا کر کہنے لگے۔

نجمہ وہیں کھڑی کھڑی شربت پینے لگی۔

”بہت گرمی ہے کیا۔“ منصور نے پوچھا۔

”جی ہاں۔ بہت ہے۔“

”وہ بھی تو ہوں گے بے چارے۔ جو پیدل چل کر آتے ہیں منصور بولے۔

”ہائے تو بہ۔ اس گرمی میں تو دم نکلتا ہے۔ مر جاتے ہوں گے۔ نجمہ نے

کان پکڑ کر کہا۔

اور اسی لمحے نمود داخل ہوئی۔ پسینے سے منہ اور گال تھمتاتے ہوئے۔

وہ ان کے قریب سے گزر گئی۔

”تم تو زندہ واپس آگئی۔“ منصور ہنس کر کہنے لگے۔

”کیوں۔“ نجمہ حیرت زدہ ہو گئی۔

وہ چپ کی آواز دبائے اُس کے قریب آگئے۔ اس لمحے نمونے آہ بھری۔
 ”ان پتوں نے کیا بگاڑا ہے آپ کا۔“ منصور آہستہ سے بولے۔
 وہ بڑی طرح چونک گئی۔ اور پھر ایک التجا بھری نظر اُس پر ڈالتی
 ہوئی بولی۔

”آپ۔ آپ خدا کے لئے۔ مجھ سے بات نہ کیا کیجیے۔ اگر کسی نے
 دیکھ لیا۔ تو۔ آپ کو کوئی کچھ نہیں کہے گا۔ مگر میری شامت آجائیگی۔“
 ”آپ اتنا ڈرتی کیوں ہیں۔؟“
 ”جی۔ میں ایک کمزور لڑکی ہوں۔ خدا کے لئے آپ جانیے۔ اوہ
 پھر وہ خود ہی تیز نیز قدم اٹھاتی ہوئی ایک طرف کوچلی گئی۔
 منصور آپ ہی آپ مسکرا دیے۔ اور آہستہ سے بولے۔
 ”بزدل“

وہ ہنس کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔

تمہاری اس گھر میں کیا حیثیت ہے۔ تو اس گھر پر فوجیہ ہے۔ منصور منجھٹے
 سے منسوب ہیں۔

منصور کی ہمدردی منجھٹے اور چی کہاں برداشت کر سکیں گی۔ اور
 یہ دنیا تیرے لئے تنگ ہو جائیگی۔ تو کہاں جائے گی۔؟ وہ ماں با
 کا ایک بیٹا ہے۔ اور پھر اُس نے جیسے ڈرتے ڈرتے صفحہ پلٹا۔ تو۔ تو
 منحوس ہے۔ کہیں تیری نحوست۔ نہیں۔ نہیں۔ یہ غلط ہے۔
 میں۔ میرا کوئی قصور نہیں۔ وہ کانپ اٹھی۔ اور پھر اُس نے
 منصور اُسے اچھا نہ سمجھے۔ اُس نے نفرت کرے۔ ٹھیک ہی ہے۔
 آج اس کا دل بار بار اڑسا رہا تھا۔ شاید اس لئے کہ اُسے احسا
 تھا۔ کہ وہ نفرت ہی کے قابل سمجھے۔؟ کیا اُس سے کوئی ہمدردی بھی نہیں
 آنسو جو بار بار بالکوں سے چھلکنا چاہتے تھے۔ آخر بند تو کر رہے نکلے۔
 نہ جانے کب تک وہ سسکتی رہی۔

سہ پہر کو وہ باہر نکلی۔ چنبیلی کی سیل کے پاس کھڑی، وہ یونہی
 پتے لوتھتی رہی۔

منصور اپنے کمرے کی کھڑکی سے کب سے اُسے دیکھ رہے تھے۔
 وہ یونہی کھوئی کھوئی سی پتے لوتھتی رہی۔ اُس کی سوچی ہوئی آنکھ
 نے فوراً منصور کو سمجھا دیا کہ وہ آج روتی رہی ہے۔

گھر ہے۔ جہاں اُس نے ایک عورت کو نوکر رکھا ہوا ہے۔ جو اس کے لئے کھانا پکاتی ہے۔ اور ماؤں جیسی محبت بھی کرتی ہے۔ اور پھر رنگ برنگی ساڑھیاں پہنے وہ لڑکیوں کو سبق دے رہی ہے۔

(۱۳)

منصور کا خیال جو اس کے دل میں آیا تھا۔ اُسے اُس نے جھٹک دیا تھا اور وہ کسی حد تک کامیاب بھی ہو گئی تھی اس میں۔

نجمہ منصور سے پڑھتی۔ منصور کی بڑی خواہش تھی کہ تم بھی اس سے کچھ پوچھو۔ مگر پوچھنا تو درکنار۔ کئی روز سے اُس نے تمہاری شکل بھی نہ دیکھی تھی۔ آج بھی شام کے وقت جب وہ نجمہ کو فارسی کے کچھ شعر سمجھا رہے تھے کہ شفیق الرحمن آگئے۔

”فارسی کے شعر سمجھا رہے ہو بیٹے۔“ انھوں نے پوچھا۔
”جی ہاں خالو جان۔“ معلوم ہوتا ہے۔ انھوں نے اتنے عرصے کتاب کھولی تک نہیں۔ منصور نجمہ کی طرف دیکھ کر مسکرائے۔
اچانک شفیق الرحمن نے پوچھ لیا۔

”نجمہ بیٹی۔ تم کو کچھ پوچھ رہے ہیں۔“

”اچھے ہی ہوں گے۔ میں نے ہتھیں پوچھا۔ نجمہ نے جواب دیا۔
”اُسے بھی کہو۔ کہ منصور سے سمجھ لیا کرے۔ جو نہ آتا ہو۔“ شفیق الرحمن نے کہا۔

نجمہ اور تم کو اُسے اسحاق ہو رہے تھے۔ نمودن رات پڑھتی اور نجمہ بھی پڑھتی۔

وہ اکثر منصور سے مدد لیا کرتی۔ حالانکہ اُس بے آرٹس لیا تھا۔ تمہارا ہنسی تو اس سے مدد لے سکتی۔ مگر تمہو کو اب بڑی احتیاط برتنی تھی وہ منصور کے سامنے بالکل نہ جاتی۔ اور سا رادن کمرے میں بند پڑھتی رہتی۔ تھوڑا بہت کام کر دیا کرتی۔

چچی جلی ہوئی بیٹھی تھیں۔ انھیں بھلا کہاں یہ برداشت ہو سکتا تھا کہ تم پڑھو اور وہ کام کرے۔ دو ہی دن میں تنگ آ گئی۔ ادم آخر ایک عورت کو بچپن روپے ماہوار پر کھانا پکانے کے لئے رکھ لیا نمودن رات محنت کر رہی تھی۔ پہلے اس کی پڑھائی ڈھنگ کی تو ہوئی نہ تھی۔ اس لیے اُسے بڑا خطرہ تھا۔ اور پھر اس پڑھائی پر تو اُس نے اپنے مستقبل کے حسین خواب دیکھے تھے۔ وہ نمودن میں کھو جاتی۔ پڑھائی کے بعد اُس نے نوکری کر لی ہے۔ اُس کا ایک چھوٹا سا خوبصورت

پوچھنا ہوگا۔ تو پوچھ لے گی۔ مجھے کہنے کی ضرورت ہے نجمہ کے غصہ آگیا۔

”میں بلانا ہوں اُسے۔“ شفیق الرحمن اٹھ کر منصور کا دل کھل آٹھا۔

پھر وہ وہیں بیٹھ کر بولے۔ گلو جاؤ۔ منو کو بلا لاؤ۔ گلو کے ساتھ جب تم آئی۔ تو مارے غصے کے نجمہ ہل کھانے لگی۔ آؤ۔ تم۔ کہو پرچے کیسے ہو رہے ہیں۔؟ شفیق الرحمن بولے۔ ”جی۔ اچھے ہی ہو رہے ہیں کچھ۔ اُس نے مختصر سا جواب دیا۔“ ”میں کہہ رہا تھا۔ منصور نجمہ کو مدد دیتے ہیں۔ تم بھی سمجھ لیا کرو۔ کچھ۔؟“

شفیق الرحمن کے الفاظ نجمہ کو تیر کی طرح لگ رہے تھے۔ وہ چچامیاں۔ اب تو امتحان ختم ہونے والے ہیں۔ اب کیا پوچھوں گی۔

وہ آہستہ سے بولی۔ اور منصور اس کی طرف غور سے دیکھنے لگے۔ اڑی اڑی سی زنگت۔ سوچی سوچی سی آنکھیں۔ فکر اور پریشانی چہرے سے ظاہر ہو رہی تھی۔ آبا بھی عجیب باتیں کرتے ہیں۔ انھیں تو اپنی قابلیت پر بڑا ناز

ہے۔ نجمہ کی جملن الفاظ کی صورت میں ڈھل گئی۔ ”آپ نے مجھے بلایا تھا۔ چچامیاں۔ تو صرف اتنا ہی کہہ سکی۔“

”وہ۔ اسی لئے۔“

”تو میں جاؤں۔؟“

”جاؤ۔ خدا تم دونوں کو کامیاب کرے۔“ ”تم واپس کرے میں چلی گئی۔ منصور اب تک کم سُم تھے۔ اور جب نجمہ نے کسی شعر کا مطلب پوچھا۔ تو وہ بول نہ سکے۔“

نجمہ۔ بس اب تم خود یاد کر لو۔“

نجمہ منہ پھلا کر وہاں سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

منصور بڑی دیر تک تم کو کے بارے میں سوچتے رہے۔ کیسی عجیب لڑکی ہے۔ اگر کوئی اُس کے ساتھ ہمدردی کرتا ہے تب بھی پڑ جاتی ہے۔ اور نجمہ کتنی جلی کٹی سناٹی ہے اُسے۔“ رات کی دیوی آہستہ آہستہ اپنا تاروں بھر لباس تھامے اتر رہی تھی۔

منصور باہر نکل آئے۔ اور یونہی چنبیلی کی بھینی بھینی خوشبو حسوس کرنے کے لئے برآمدے میں چڑھتی ہوئی بیلوں کے پاس کھڑے رہے۔

وہ زمینی سکون کے لئے پھر بہنے لگے۔
 اور نجمہ کو لے کر تخت پوش پر بیٹھ گئے۔ نجمہ مسکرا مسکرا کر
 دیکھتی رہی۔ اور یہ مسکراہٹ منصور کے دل کو کھنکھاتا ہوا
 لگی۔

تمو کے سیم زدہ کرنے کی بچی چل رہی تھی۔ اور وہ اس زرد زرد
 بیامنی روشنی کو دیکھ کر انہونی باتیں سوچ رہے تھے۔
 ”بیٹا کیا بات ہے۔؟ رشید دیکھ کر قریب آکر بولیں۔
 ”کچھ نہیں خالہ۔۔۔ نجمہ بوٹھ گئی ہیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ
 منصور نے بات بنائی۔

”ارے۔۔۔ تو بھی لڑکھ ہے۔ وہ خوشی سے تہمتہ لگا کر بولیں۔
 ”میں ابھی ڈانٹتی ہوں اُسے۔ وہ ہنستے ہوئے نجمہ کے کمرے کی
 طرف چلی گئیں۔ اور منصور نے چین کا سانس لیا۔
 نجمہ کو جا کر رشیدہ نے خوب ہنس مہنس کر بتایا کہ منصور تہمتہ
 روٹھنے پر کتنے پریشان ہیں۔ نجمہ کاموڈ فوراً درست ہو گیا۔
 اور وہ شیشے میں اپنا آپ دیکھنے ہوئے باہر آگئی۔
 منصور اب تک اُسی زرد روشنی کو دیکھ رہے تھے۔ وہ قریب آکر
 کھڑی ہو گئی۔

”نجمہ۔ منصور مسکرا رہے۔“
 ”جی۔“

اور منصور سوچنے لگے۔ نجمہ کتنی اچھی ہے۔ اور تمو۔ چڑچڑی بددماغ
 لکڑان کے دماغ نے دو ٹوک میں سے ایک بات کو بھی تسلیم نہ کیا۔

وہ شرمناک رپودانتوں میں دبائے لگی۔
”نہجہ۔ ۹۔“

”جی۔ ۹۔“

”وہ آج کیا کیا پاک رہا ہے۔“

”آج۔ پلاؤ۔ فورم۔ فیئرٹی۔ اور جانے کیا کیا۔ میں تو بادرچی خانے
میں گئی تھی۔“

”کون پکار رہا ہے۔ ۹۔“

”تمو اور مانا۔“

”یہ تم بھی مشین معلوم ہوتی ہے نہجہ۔ ۹۔“

”آپ بڑی ہمدردی کرتے ہیں۔ ۹۔“ نہجہ نہ رو سکی۔

”میں۔ ۹۔“ منصور چونک گئے۔

”جی ہاں۔ ۹۔“

”بس نہجہ میں تو اسے مظلوم سمجھتا ہوں۔“

جی ہاں۔ وہ مظلوم نہیں۔ بڑی زبان دراز لڑکی ہے۔

اس بھول میں مٹت رہی۔

اور منصور کو نہجہ کی اس بات پر یقین آگیا۔

”مگر نہجہ۔ وہ کیوں ایسی ہے۔ ۹۔“

(۱۴)

خدا خدا کر کے امتحان ختم ہوئے۔ رشیدہ بیگم نے آج میلاد
کروایا تھا۔

بہت سی عورتیں آئی ہوئی تھیں۔ میلاد پڑھنا جا رہا تھا۔ تمو
ماما کے ساتھ مل کر کھانا وغیرہ تیار کر رہی تھی۔ امتحانوں کی محنت نے
اسے بڑا کمزور کر دیا تھا۔ اور اس پر طرہ یہ کہ ایک دن بھی اسے آرام
کو نہ ملا تھا۔ کل ہی تو امتحان ختم ہوئے تھے۔ اور آج وہ پھر کام پر لگی تھی۔
اندر سفید کپڑوں میں طبوس بیویاں۔ لہک لہک کر پڑھ رہی تھیں۔
منصور اپنے کمرے میں تھے۔ نہجہ ان کے پاس تھی۔ اور آج وہ کچھ جانے
کا پروگرام بنا رہی تھی۔

آج تو گھر میں خالہ نے میلاد لگا رکھا ہے منصور مسکرا بے۔

ہاں اماں کی عادت ہے۔ اب میرے لئے میلاد مانا تھا کہ خیر سے

امتحان دے۔ تو میلاد کرواؤں گی۔

”بہت پیاری ہو انھیں۔ ۹۔“

”وہ۔ میں کیا جانوں۔ ابھی تو اس کا غرور ٹوٹ گیا ہے۔“

جب دادی اماں زندہ تھیں۔ کبھی بھول کر ہمارے ہاں نہیں آئی تھی۔ بڑے ٹھاٹھ سے رہتی تھی۔ دادی اماں اُسے اچھے اچھے کپڑے پہنواتی تھیں۔ بہت لادُسے رکھتا تھا۔ تب ہی تو دباغ میں اتنا غرور بھر گیا ہے۔ نجمہ ماتھے پر تیوری ڈالے کہہ رہی تھی۔

”پچھر۔“

”دادی اماں کے مرتے ہی سب غرور ٹوٹ گیا۔ ہم سے نفرت کرتی تھی نا۔“

ہمارے ہی ٹکڑوں پر گزارہ کرتا پڑا۔

”اچھا۔ منصور کو تمہو کی داستان سے نہ جانے کیوں دلچسپی بڑھتی جا رہی تھی۔“

”ہاں مجھے تو کبھی دیکھ نہ سکتی تھی۔“

رشیدہ بیگم باہر سے چلائیں۔

”نجمہ۔ کھجوریں اور الائچی کہاں رکھی ہیں تم نے۔“

”اماں بھلا یہی ہیں“ نجمہ نے کہا۔

”جلو۔ میں بھی باہر جا رہا ہوں۔“

دونوں ساتھ ساتھ باہر آئے۔ نمونیشیں دھو رہی تھی۔ دونوں کو

ساتھ دیکھ کر نہ جانے کیوں اسے اچھا نہ لگا۔

نجمہ تو ماں کے ساتھ اندر چلی گئی۔ اور منصور وہیں کرسی پر بیٹھ گئے۔ اُن سے چند قدم کے فاصلے پر نمونہ صحن میں لگے ہوئے نل کے نیچے پلیٹیں دھو رہی تھی۔

”سُنیئے۔“ منصور نہ چاہتے ہوئے بھی اُسے بلا بیٹھے۔

”جی۔“ وہ مڑ کر اُن کی طرف دیکھنے لگی۔

”آپ کے پیپر کیسے ہوئے۔“ منصور پوچھنے لگے۔

”اچھے ہی ہو گئے ہیں شکریہ۔“

اس لمحے وہ منصور کو بڑی جہذب معلوم ہوئی۔ نیچی نگاہیں کئے وہ ڈھیر ساری پلیٹیں دھو رہی تھی۔

ناہید کا خط آیا تھا۔ منصور نے دوبارہ بات ڈھونڈی۔ وہ

صرف نظریں اٹھا کر رہ گئی۔ اور جن کی کشش میں منصور کو اپنا آپ ڈولنا ہوا محسوس ہوا۔

”آپ کا پوچھا۔ سلام بھی لکھا ہے۔“

”اُسے میرا بڑا خیال ہے۔“ منصور د سے بولی۔

”میں بھلا اُسے کیا لکھتا۔ آپ تو ہم سے ناراض ہیں۔ شاید نہ

جانے کیوں ناراض ہیں۔“ کیا مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی ہے۔ کہ

میں نے کوئی بات کر دی ہے۔ جو آپ کو بُری لگی ہے۔؟
 ”جی۔؟ اُس کی آنکھوں میں آنسو ٹپکنے لگے۔

”بتائیے نا۔ کیوں۔ میں۔ میں بڑا بے چین ہوں۔

”میں۔ آپ سے اُس روز کی معافی مانگتی ہوں۔ وہ آنسو دوپٹے سے صاف کرتے ہوئے کہنے لگی۔ میں۔ دراصل کبھی کبھی اتنی پاگل ہو جاتی ہوں۔ جو مُتہ میں آتا ہے کہہ جاتی ہوں۔ آپ مجھے معاف کر دو۔ جب وہ یہ فقرے کہہ رہی تھی۔ منصور اس کے لہجے کے درد سے متاثر ہو رہا تھا۔ جس میں بڑی حقیقت تھی۔

”آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں۔؟ مجھے تو کچھ بھی بُرا نہیں لگا۔“
 ”شکریہ۔؟“

”ایک بات کہوں۔؟ منصور کے لفظ کا تپ رہے تھے۔ اُس نے بھگی ہوئی آنکھیں اوپر اٹھا دیں۔

”کیا آپ اکیلے میں مجھے ملیں گی۔؟ میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔“
 ”جی۔؟“ وہ حیرت سے گھٹتی ہوئی آواز میں بولی۔

”بتائیے نا۔؟ پھر کوئی آجائے گا۔

”نہیں منصور صاحب۔ میں آپ سے نہیں مل سکتی۔ اس کے

لہجے میں پھر سختی آجلی تھی۔

”خدا کے لئے تم۔؟ منصور کے لہجے میں التجا تھی۔“

”نہیں۔؟“ ”تمو کا لہجہ ایک دم بدل گیا۔ وہ سمجھتا ہے لی کہ کیوں اتنا بڑھی۔

”تمو۔؟“ منصور کی آواز میں اپنائیت تھی۔

ادھر اسی لمحے تمو کے ہاتھ سے پلیٹیں چھوٹ گئیں اکٹھی دس پلیٹیں۔ رشیدہ اور نجمہ باہر ہی آرہی تھیں۔

”ہائیں۔ ستیاناس ہو گیا۔“ رشیدہ چیخی۔

”یہ تو ساری ٹوٹ گئیں۔“ نجمہ نے کہا۔

”تیرا ناس جائے۔ یہ سیٹ تباہ کر کے رکھ دیا۔ رشیدہ بیگم غصے سے تمو کی طرف بڑھیں۔ جو کانپ رہی تھی۔

اور زندگی میں پہلی مرتبہ اس کے گالوں پر ایک زوردار طمانچہ پڑا۔ منصور زڑپ کر اٹھے اور سخت لہجے میں بولے۔

”خالہ جان۔ یہ کیا کر رہی ہیں آپ۔؟“

تمو نے اپنا ایک ہاتھ اپنے گال پر رکھ لیا۔ اور اس کے آنسو گرنے لگے۔

”رشیدہ بیگم غصے میں بولیں۔

”کم سخت بخوس۔ میرا گھر تباہ کر دے گی۔ یہ اکٹھی دس پلیٹیں توڑ

دیں۔ کیا قبر سے تیرے ماں باپ آئیں گے۔ یہ نقصان بھرنے۔

تم تو زپ کرتیزی سے اپنے کمرے کی طرف بھاگ گئی۔ گلو بیٹوں کے ٹکڑے اٹھانے لگا۔ رشیدہ غصے سے بل کھاتی باورچی خانے کی طرف چلی گئی۔

منصور کا چہرہ نئے سرے سے بھر بخ ہو رہا تھا۔ وہ جلدی اپنے کمرے میں چلے گئے۔ اُن کو ڈر تھا کہ غصے میں نہ جانے کیا کیا کر دیں۔ تجربہ بھی ماں کے پیچھے پیچھے چلی گئی۔

تمو تکیے میں منہ چھپائے بڑی طرح سسک رہی تھی۔ اُسے زندگی میں پہلی مرتبہ کسی نے مارا تھا۔ اور وہ بھی منصور کے سوا دعوت ہوتی رہی۔ تمو کو کسی نے نہ پوچھا۔ اُس کی آنکھیں سڑ گئیں۔ شام گہری ہو گئی تھی۔ کمرے میں ملگجا اندھیرا چھایا تھا وہ اُسی طرح اندھی پلنگ پر پڑی تھی۔

”منصور کا موڈ بہت خراب تھا۔ وہ اُسی وقت کپڑے پہن باہر چلے گئے تھے۔ اور کافی رات کو لوٹے۔ جب وہ گھر آئے تو جہاں جا چکے تھے وہ تخت پوش پر بیٹھ گئے۔ رشیدہ بیگم سا چار پائی پر بیٹھی تھیں۔ انھیں دیکھ کر بولیں۔“

”ارے بیٹا۔ کہاں چلے گئے تھے۔“

”کہیں نہیں۔ ذرا گھومنے چلا گیا تھا۔“

”اچھا تو۔ اپنے خالو کے ساتھ ہی کھا لو کھانا۔ اُنھوں نے بھی تمہارے انتظار میں ابھی نہیں کھایا۔ وہ کھانا نکالنے چلی گئیں۔ منصور وہیں خالو کے ساتھ بیٹھ گئے۔ گو اُن کا دل کھانے کو نہ چاہتا تھا۔ مگر شفیق الرحمن کی خاطر بیٹھ گئے۔“

رشیدہ نے کھانا لگا دیا۔ وہ بے دلی سے کھاتے رہے۔ اُن کا دھیان پھر تمو کی طرف چلا گیا۔ نہ جانے اُس نے کھانا کھایا یا نہیں۔ بارہا اُن کا جی چاہا کہ وہ تمو کے بارے میں دریافت کریں مگر وہ نہ پوچھ سکے۔

گلو اُن کے لئے پانی کا جگ بھر کر قریب لایا تو منصور اُٹھستے سے بولے۔

”گلو ذرا میرے کمرے میں آنا۔ کچھ کام ہے۔!“

وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑتے ہوئے ایک طرف کو ہو گیا۔ کھانا اُنھوں نے جلد ہی کھا لیا۔

کیوں بیٹا۔ بڑی جلدی ہاتھ کیسٹ لیا۔ شفیق الرحمن نے منصور کی خاموشی کو محسوس کیا۔

جی۔ کچھ ٹھوک نہیں ہے آج وہ تم تو نظر آ رہی۔ کہاں سے؟

شفیق الرحمن ادھر ادھر دیکھ کر پوچھنے لگے۔

وہ آج تیس چالیس روپے کا نقصان کر کے اپنے کمرے میں پڑی ہے۔

رشیدہ کے لہجے میں طنز تھا۔

”کیا مطلب؟“

”آپ کی بھتیجی نے اکٹھی دس پلیٹیں توڑ دی ہیں۔ رشیدہ زور سے بولیں۔

”تو پھر شفیق الرحمن کھگیا سے گئے۔

”یعنی کچھ ہوا ہی نہیں۔ میں کہتی ہوں۔ اصل چینی کا سیٹ تھ آج ہی نکالا تھا۔ اُس کی نحوست اور کیا کیا کروائے گی؟“

شفیق الرحمن کے پاس کچھ جواب نہ تھا۔ وہ صرف منصور کو دیکھ کر رہ گئے جو پہلے سے اُنھیں گھور کر دیکھ رہے تھے۔

”اُس نے کھانا کھایا؟ شفیق الرحمن پھر بولے۔

”میری بھلا سے۔ مجھے تو پلیٹوں کا بہت غم ہے۔ میری جوتی پوچھتی ہے۔“

جاؤ گاؤ۔ تم کو کھانا دے آؤ۔

میں گیا تھا میاں۔ وہ کہتی تھیں۔ مجھے بھوک نہیں۔ گلو بولا۔

”رہنے دو۔ اب ہم سے خوشامدیں نہیں ہوتیں۔ ایک تو نقصان کر دیا اور ایک ناراض بیٹھی ہیں۔ اُلٹا چور کو تو ال کوڑا نٹے۔ ایسا اندھیر بھی دیکھا ہے کہیں۔ رشیدہ اُسی طرح بولیں۔

منصور اپنے کمرے کی طرف آتے ہوئے برآمدے سے گزرے۔ چنبیلی کے پاس کھڑے ہو کر اُن کی نظر تھو کے کمرے کی طرف اُٹھی۔ جہاں گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ اُن کے دل پر ایک چوٹ سی لگی اور پھر اُن کا جی چاہنے لگا کہ وہ تھو کے کمرے میں جا کر اُسے تسلی دیں۔ مگر یہ خواہش دل ہی میں رہ گئی۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھا ہوئے اپنے کمرے میں چلے آئے۔ دیکھا تو گلو پہلے سے موجود تھا۔

”آپ نے مجھے بلایا تھا۔ صاحب؟“

”ہاں گلو۔ وہ تھو کے کھانا کھایا ہے۔ حالانکہ شفیق الرحمن نے اس بات کو چھپڑا نہیں بتا دیا تھا کہ تھو کے کھانا نہیں کھایا۔

وہ صاحب۔ میں کئی بار گیا۔ وہ بُری طرح رو رہی تھی۔ چپ نہیں ہوتیں۔ صاحب۔ بڑی بی بی جی اُن کو بڑا دکھ دیتی ہیں۔ میرا جی چاہتا ہے۔ صاحب کہ میں اُنھیں لے کر کہیں چلا جاؤں۔

میں اُن کے لئے نوکری کروں گا۔ یہ جھڑکیاں تو نہیں ہوں گی نا۔ مگر صاحب۔ وہ میرے ساتھ نہیں جائیں گی۔ مجھ سے اُن کا

دکھ نہیں دیکھا جاتا۔ گلو کی آواز پھرا گئی۔

منصور گلو کی باتیں سن کر حیران رہ گئے۔ اچھا جاؤ۔ گلو۔ وہ بے
میں کہنے لگے۔

”مگر صاحب۔ آپ نے مجھے بلایا تھا۔

”بس یونہی۔ جاؤ۔“

گلو حیرت سے انھیں دیکھتا ہوا باز رکھ گیا۔ اُس کے جانے کے
بعد سنجہ آگئی۔

”آپ نے شاید آماں کی باتوں کا بُرا منایا ہے۔“

”نہیں سنجہ۔“

ضردر آپ کو بُرا لگا ہے۔ مگر میں پوچھتی ہوں۔ آپ کو بُرا کیوں لگا۔
آخر کیوں اس سے اتنی ہمدردی کرتے ہیں۔

سنجہ۔ خالہ جان کو دست درازی سے کام نہیں لینا چاہیے۔

”مگر اس نے نقصان بھی تو کم نہیں کیا۔“

”انسان غلطیوں کا پتلا ہے۔ اُس نے جان بوجھ کر تو ایسا نہیں
کیا ہو گا۔“

وہ تو چاہتی ہے کہ ہمارا گھر برباد ہو جائے۔ اور اسی نے

”تم غلطی پر سنجہ۔“

”مگر۔ آپ اُس کی اتنی سائیڈ کیوں لیتے ہیں۔“

منصور نہ جانے کیوں سنجہ کو کوئی جواب نہ دے سکے۔

”بتائیے نا۔“ سنجہ نے اپنا سوال دوہرایا۔

فصول باتوں کا میرے پاس کیا جواب ہے۔ ہر منصور سستی سے

بولے۔

اور سنجہ کچھ مرعوب سی ہو گئی۔ اور بات بناتے ہوئے کہنے لگی۔

چلیے چھوڑیے۔ ہم کیوں اُس شخصیت کے ڈھیر کے لئے اپنے دل

خراب کریں۔“

سنجہ۔ تم پڑھی لکھی ہو۔ مجھے ایسے الفاظ تمہارے مُنہ سے سن کر

دکھ ہوتا ہے۔

سنجہ چپ سی ہو گئی۔ کچھ دیر اُس نے ادھر ادھر کی باتیں کیں۔

اُس نے محسوس کیا کہ منصور دلچسپی نہیں لے رہے۔ تو وہ باہر چلی گئی۔

رات آہستہ آہستہ رینگ رہی تھی۔

منصور کپڑے بدل کر باہر اپنے بستر پر لیٹے تھے۔ نیند اُن کی

آنکھوں سے قطعی دور تھی۔ وہ تقریباً تھری کیسل کی دوڑیاں

ختم کر چکے تھے۔ بار بار اُن کی نظریں منو کے نیم رہ کرے کی طرف

جاتیں۔ جہاں ایک عجیب سی خاموشی تھی اور ایک پراسرار سا اندھیرا۔

آج اُن کا ذہن کوئی فیصلہ کر لینا چاہتا تھا۔ اپنی اس بے چینی کو وہ سمجھ رہے تھے۔ اور ایک سوال بار بار ذہن سے مکرار ہاتھ لگاتے تھے۔ ”کیوں؟ آخر کیوں؟“

اور پھر اُن کے ذہن نے فیصلہ کر لیا کہ وہ ضرور تم کو چاہتے ہیں۔ تم تو تیری سے اُن کے حواس پر چھا رہی ہے۔ وہ اس کے لئے تب ہی بے چین ہیں۔ اسی لئے۔

”تو پھر۔“ (ا کی)

”پھر۔ کیا تم کو بھی اسے پسند کرے گی۔ اور پھر تم کو کی بے مرنخی یاد کر کے وہ بے چین ہو گئے۔“

(۱۵)

صبح منصور اُتار ہونے کی وجہ سے گھر ہی تھے۔ شفیق الرحمن بھی گھر تھے۔ ناشتے پر شفیق الرحمن نے پھر کو چھپا۔

”تم تو نہیں اٹھی ابھی تک۔“

”نہیں۔ بخم نے جواب دیا۔“

”دیکھو۔“

”اٹھ جائے گی۔“

”وہ اتنی دیر تک تو نہیں سوتی۔ اٹھ سوج رہے ہیں۔“

”ہائے خدایا۔ یہ تم تو مجھے بی۔ بی کر دے گی۔ رشیدہ چچی۔“

”گلو۔ جاؤ۔ تم کو دیکھو۔ ابھی تک کیوں نہیں اٹھیں۔“

”گلو چلا گیا۔ منصور کو اپنی خالہ اُس دم بڑی مکار نظر آئیں۔“

”مقوڑی ہی دیر میں گلو گھبرا ہوا آیا۔ صاحب۔ بی بی تو بولتی ہی نہیں۔ میں نے کتنا بلایا۔“

”منصور کا دل دھک سا ہو گیا۔ اور شفیق الرحمن کے ہاتھ سے

چائے کی پیالی چھوٹ گئی۔

ہائیں۔ خدا خیر کرے۔ وہ ننگے پاؤں بھاگے۔ اور اُن کے پیچھے ہی منصور بھی۔ اور ساتھ ہی رشیدہ اور نجمہ۔

”بیٹا۔ دیکھو۔ شفیق الرحمن تم کو کے پلنگ کے پاس کھڑے ہوئے ہیں۔“

”ہائے۔ کچھ کہا تو نہیں لیا۔؟ نجمہ بولی۔

اور منصور قہر کی نظر اُس پر ڈال کر آگے بڑھنے۔ تم کو کا چہرہ سفید ہو رہا تھا۔ منصور دھڑکتے دل سے اُس کا ہاتھ پکڑ کر تبض دیکھنے لگے۔ تبض کی رفتار دیکھ کر وہ کچھ مطمئن ہوئے۔

”گلو جاؤ میرا بیگ اٹھا لاؤ۔ نجمہ ایک گلاس پانی لاؤ۔ گلو میگ لے آیا۔

منصور بڑے انہماک سے تم کو کی تشخیص کرنے لگے۔ انھوں نے کوئی دوا اِکال کر اُسے سنگھائی۔ اور پھر انجکشن تیار کر کے بازو میں گادیا۔

رشیدہ جل کر چلی گئیں۔ نجمہ بھی اُن کے پیچھے چلی گئی۔

”ہوں۔“ جھونگ رچا رہی ہے۔ نجمہ نے جل کر کہا۔

”ہاں۔ اور کیا۔ رشیدہ بولیں۔“

ادھر شفیق الرحمن منصور سے کہنے لگے۔

”بیٹا۔ ذرا غور سے دیکھو۔؟ تمہاری حال تو اُسے مار ڈالے گی۔“

”آج بہت ہمدردی ہو رہی ہے۔ خالو جان منصور کے لبوں پر طنز پر مسکراہٹ پھیل گئی۔“

شفیق الرحمن شرمندہ ہو گئے اور تم کو کے سر پر ہاتھ پھرنے لگے۔ تم کو نے آنکھیں کھولیں تو منصور کا چہرہ نظر آیا۔ وہ کچھ لمحے یوں دیکھتی رہی۔ اور پھر گہرا کر اُٹھنے لگی۔

”لیٹی رہو بیٹی۔ شفیق الرحمن بولے۔

”نہیں۔ میں۔ وہ ویران نظروں سے اُن دونوں کو دیکھنے لگی۔“

”آپ خدا کے لئے لیٹی رہیے۔ اب کے منصور بولے۔

”خالو جان۔ اُن کے لئے ہلکا سا ناشتہ چاہیے۔ صرف دو دودھ

اور ٹوسٹ!“

”اچھا بیٹا۔ میں ابھی گلو سے کہتا ہوں۔ شفیق الرحمن باہر نکل گئے۔“

اُن کے جانے کے بعد تم کو اور زیادہ گہرا گئی۔ وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی

اور لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔

”آپ جائیے۔ اب۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔“

”آپ مجھے دھکے دے کر بھی نکال دے تو میں نہیں جاؤں گا۔ منصور

مسکرائے۔

”جی۔؟ وہ حیرت سے اُسے دیکھنے لگی۔

”ہوں۔؟“ منصور نے سر ہلایا۔

”گر۔؟“

مگر وہ کچھ نہیں۔ آپ مرنے کے موڈ میں معلوم ہوتی ہیں۔

”کاش۔ اُسیا ہوتا۔؟“ وہ دُکھ سے بولی۔

”کیوں“ منصور کے لہجے میں اپنائیت تھی۔

”میری زندگی کس مصروف کی۔؟“

”آپ کو اپنے بارے میں غلط فہمی ہے۔“

”دیکھئے نا۔ وہ اپنے ناخن کھرچتے ہوئے کہنے لگی۔ اگر میں مرنے

تو کسے افسوس ہوگا بلکہ سب کہیں گے۔ اچھا ہی ہوا۔

”دیکھئے نا۔ مجھ جیسے محسوس انسان کو مر ہی جانا چاہیئے۔ تاکہ لوگ

میرے سائے سے بچ جائیں۔ آپ کو وہم نہیں آتا۔ جانیئے نا۔!“

”تم پاگل ہو۔؟“ منصور اب تم پر اتر آیا۔

”جی۔؟ وہ اس بے تکلفی سے چونک گئی۔

”جی۔؟ اُس نے بڑے اسٹائل سے سر ہلایا۔

”بس سچ کہتی ہوں۔ میری زندگی کی کسی کو ضرورت نہیں۔

”اگر کسی کو ہو تو۔ وہ بغیر سوچے سمجھے کہہ گیا۔

”اور وہ پھر کانپ گئی۔ کتنی غمبہ تھی وہ۔“

گلو گلاس میں دودھ اور پلیٹ میں ٹوسٹ رکھتے لے آیا۔

”آپ۔ کیوں میرے لئے اپنا وقت خراب کرتے ہیں۔ اُس نے پھر کہا۔

”میں پچھتر ماہوں کا اب۔“

اور تو پھر حیرت سے دیکھنے لگی۔ یہ کیا۔

شفیق الرحمن آگئے۔ تب وہ بار بار پلکیں جھپکنے لگی۔

یہ لیجئے۔ منصور نے اُسے مدبھی نظروں سے دیکھتے ہوئے گلاس

نہایا۔ وہ گھبراہٹ میں جلدی سے گلاس کیڑکڑچینے لگی۔ منصور

اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے دیکھ کر مسکرائے لگے۔

ایک سانس میں گلاس خالی کر کے اُس نے بڑے بھولے پن سے

گلاس منصور کے آگے کر دیا۔ اور اسی لمحے منصور نے ٹوسٹ آگے

کر دیے۔

”یہ۔؟“ وہ شرمندہ سی ہو گئی۔ دودھ تو ٹوسٹ کے ساتھ

پینا تھا۔ اُس نے پھینکی سی ہنسی کے ساتھ ٹوسٹ پکڑ لیے۔

منصور ہنس کر شفیق الرحمن کو دیکھنے لگے جو کرسی پر بیٹھے اخبار

دیکھنے لگے تھے۔ آنکھوں نے دوبارہ منمو کی طرف دیکھا جو بری

جھینپ رہی تھی۔

”اب بستر سے نہ اٹھئے گا۔ ورنہ منصور نے تم کو تھپڑ دکھایا۔
وہ اُس کی بے تکلفی سے پیچ مچ جیران تھی۔

(۱۶)

شام پھر منصور تم کو کے پاس آئے۔ وہ جلدی سے اٹھ بیٹھی۔
”انجکشن۔“ وہ بیگ سے سرخ نکال کر بولے۔
”جی۔ اب تو میں ٹھیک ہوں۔ وہ جھجکتے ہوئے کہنے لگی۔
”مازہ آگے کرو؟“

”میں اب بالکل ٹھیک ہوں۔!“

اُس نے پھر کہا۔

”پلیز۔ بازو آگے کرو۔“

میں۔ اب بیمار نہیں ہوں۔

”بازو۔“

”میں۔!“

”تھپڑ۔!“ منصور نے ہاتھ دکھایا۔

اُس نے جھلا کر بازو آگے کر دیا۔

منصور نے انجکشن لگا دیا۔

منصور کا دل تو نہ چاہتا تھا کہ وہ اٹھ کر جائے مگر مجبوری کی وجہ
سے اُٹھیں اُٹھنا ہی پڑا۔ وہ اُس پر میٹھی نظریں ڈالتے ہوئے باہر
نکل گئے۔ اُن کی نگاہیں نہ جانے کیوں تم کو چھیتی ہوئی معلوم ہوئیں
وہ سر جھکا کر سوچنے لگی۔

شفیق الرحمن انبار سے نظریں ہٹا کر اُسے تالیاں دینے لگے۔
تمو۔ تم اپنی جچی کی باتوں کا بُرا مت منایا کرو۔ وہ نوشروع سے
ابسی ہی ہیں۔ میں سمجھا دوں گا۔ وہ کافی دیر اُس کے پاس بیٹھ رہے۔
پھر اٹھ کر چلے گئے۔ تم لوٹ گئی۔ وہ منصور کی اس بے تکلفی پر آپ ہی
آپ مسکرا دی۔

اور پھر وہ پاس پڑی ہوئی کرسی کھینچ کر بیٹھ گئے۔
اب تو انسجکشن لگا دیا۔ وہ جھپٹتے ہوئے کہنے لگی۔
تو پھر۔

”آپ۔ جانیے نا۔“

منصور اب گئے زور سے ہنس پڑے۔

”کیوں۔“ وہ خفگی سے بولی۔

”آخر تم مجھ سے اتنا گھبراتی کیوں ہو۔ میں کیا ہوتا ہوں۔“

”وہ۔ میرا مطلب ہے۔ چچی جان برا منائیں گی۔“

”تم اپنی کہو۔ تمہیں تو برا نہیں لگتا۔“

”مجھے۔“ وہ گھبرا گئی۔ کہ اس بات کا کیا جواب دے۔

”کہو نا۔“

”کیا۔“

یہی کہ تمہیں میرا برا نہیں لگتا۔“

مجھے بھلا کیوں برا لگنے لگے۔ وہ یہ کہتے ہوئے کچھ مڑخ سی ہو گئی۔

تو بس پھر لوگوں کی باتیں رہنے دو۔

”مگر۔“

”تم بہت بزدل ہو۔“

آپ۔ اب جائیں نا۔ وہ عاجزی سے بولی۔

اچھا اب پھر کبھی نہیں آئیں گے۔ آپ سے معافی بھی چاہتے ہیں
کہ آپ کو اتنی تکلیف دی۔ وہ مصنوعی غصے سے بولے۔

”جی۔“

منصور غصے سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ جانے کے لئے قدم بڑھایا
تو نمونے بغیر سوچے سمجھے اسے آواز دے دی۔

”سنیے۔“

وہ پلٹ گئے۔

آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔

”کیا۔“

ادنیٰ تو یہ آپ تو جرح کرنے لگتے ہیں۔ وہ تنگ آ گئی۔

”مگر سمجھاؤ بھی نا۔“

اب۔ جانیے نا۔ وہ پھر کہنے لگی۔

اور اس مرتبہ منصور زور سے ہنس دیے۔ ساتھ نمونہ بھی ہنسنے
لگی۔ اپنی اس بے تکلی سی بات پر اس نے کئی بار اسے کہا تھا۔
میں رات کو آؤں گا۔ وہ جاتے ہوئے کہنے لگے۔

نہیں۔ نہیں۔ وہ کانپ گئی۔

آؤں گا۔

نہیں۔

آؤں گا۔

نہیں۔ خدا کے لئے۔

تھپڑ منصور نے پھر ہاتھ دکھایا۔

وہ باہر نکل آیا۔ اُس نے دیکھا۔ نجمہ اور رشیدہ کی بڑی

نظریں اُس پر پڑ رہی تھیں۔

(۱۷)

تموَجَب کمرے سے باہر نکلی تو گھر کا ماحول بڑا گھٹا گھٹا سا تھا۔

نجمہ اُسے دیکھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ رشیدہ اُسے نظر انداز کر گئی۔

”چیچی۔“ وہ سہمی ہوئی آواز میں بولی۔

”کیا ہے۔“

لائیے۔ میں آٹا گوندھ دوں۔

نہیں تم رانی بنی رہو۔ پلنگ سے بہت اٹھو۔ میں لو کر ہوں

تمہاری۔

لے آؤں گی کھانا وغیرہ تمہارے لئے۔

چیچی۔ میں تو۔

بس جہربانی کرو۔ تمہیں بڑے مکر آتے ہیں۔ ہم نے تو یہ مکاریاں

کہیں نہ دیکھی تھیں۔

چیچی۔ مجھے اللہ کی قسم۔ مجھے معلوم نہیں۔ مجھے کیا ہو گیا تھا۔

وہ۔ رد ہانسی ہو گئی۔

قبر میں جاسونا ہے۔

رات ہو چکی تھی۔

گلو اس کے لئے کھانا لے آیا۔ وہ کھانا کھاتے ہوئے عجیب سی گھٹن محسوس کر رہی تھی۔ یوں لگتا جیسے اس گھٹن میں اس کا دم گھٹ کر رہ جائے گا۔

گلو برتن لے کر چلا گیا تو وہ لیٹ گئی۔ اُس نے روشنی بھی نہ کی۔ جب منہ میں ہی گھٹا ٹوپ اندھیرے چھائے ہوئے تھے۔ پھر یہ روشنی اس کی زندگی کو منور کر سکتی تھی۔

تین دن اس کی بے چین آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ کئی گھنٹے بیت گئے۔ اور پھر اپنے قریب ہی اُسے آہٹ سنائی دی۔ وہ چونک گئی۔

تمو؟ ایک سرگوشی ابھری۔

آواز منصور کی تھی۔ وہ اٹھ بیٹھی۔

آپ مجھے بدنام کرنے پر مٹے ہوئے ہیں۔ کیوں آئے ہیں اس اندھیرے میں میرے پاس۔ وہ سختی سے بولی۔

تمو۔ میں تم سے باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ منصور کی آواز میں التجا تھی۔

میں آپ کی کوئی بات نہیں سننا چاہتی۔ وہ سختی سے بولی۔

تمو۔ تم مجھے غلط نہ سمجھو۔ میں تمہیں مشورہ دینا چاہتا ہوں۔ دن میں تم مجھے مل نہیں سکتیں۔ کچھ دیر مجھے اجازت دے دو۔ میں تمہیں کچھ

ہاں ہاں۔ دورہ اٹھا لیتا۔ مگر پھر بھی بیچ گئیں۔ رشیدہ

کاش۔ میں مرجاتی۔ وہ رودی۔

موت غیرت والوں کو آیا کرتی ہے تم جیسوں کو نہیں۔ وہ پردہ پوشہ رکھ کر سسکتے لگی۔

خدا کے لئے اب میرا گھر یوں برباد کرو۔ تمہارا یہ آنسو کیا کریں گے۔ میری ایک بچی ہے۔ اللہ اُسے تمہارے سارے بھی بچائے۔

”چچی۔“

میں تمہاری کچھ نہیں لگتی۔

وہ چپ چاپ اپنے سیم زدہ کمرے میں آگئی۔ اس کا غمگسار آہ۔ یہ کیا ہو رہا ہے۔ کیا میں اتنی ہی حرام نصیب ہوں۔ ذہن ایک کونے سے آواز اٹھی۔ اپنی جاوید علیحدہ کر لو۔ اور خود اکیلی رہو۔ تم کیوں اپنے آپ کو برباد کر رہی ہو۔ منصور سے مدد لو۔ تم بڑھی ہو ہو۔ دنیا کو ایک سبق دو۔

مگر پھر اُسے احساس ہوا کہ ایک تنہا لڑکی کا اکیلا رہنا کس قدر خطرناک ہے۔ وہ کس طرح رہ سکتی ہے۔ کیوں کر رہ سکتی ہے۔ بونہی رہنا ہے۔ بونہی سسکتا ہے۔ اور پھر ایک دن اربان

باتیں بتاؤں گا۔

میں نے کہہ دیا کہ میں آپ کی کوئی بات نہیں سنوں گی۔

تمو۔ تم پاگل ہو۔ تمہیں دشمن اور دوست کی بھی تمیز نہیں ہے
منصور غصے سے بولے۔

آپ سب میرے دشمن ہیں۔ میں یہی سمجھتی ہوں۔ آپ بھی مجھے ہذا
کرنے کے لئے یہ سب کچھ کر رہے ہیں۔ وہ پاگل سی ہو رہی تھی۔
تمو۔ منصور تیز لہجے میں بولے۔

جی ہاں۔ آپ کی یہ سیکم کامیاب نہیں ہو سکتی۔ وہ بھڑائی ہوئی
آواز میں بولی۔

اور اگلے لمحے منصور کا ایک بھر پور طمانچہ تمو کے گال پر تھا۔
وہ کئی کئی رہ گئی۔ اپنے گال پر ہاتھ رکھ کر کچھ دیر وہ منصور کو دیکھ
رہی۔ پھر دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا کر رو دی۔

منصور اپنی اس جسارت پر خود ہی دم بخود رہ گئے۔ کچھ لمحے وہ اپنے ہا
کو دیکھتے رہے۔ اور پھر تیزی سے باہر نکل گئے۔

یہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہو گیا۔ کہ وہ سوچ بھی نہ سکے۔

نہ جانے کیوں۔ تمو کو اس ٹھپڑ سے کچھ سکون مل گیا تھا۔ وہ آنسو صاف
کر کے لیٹ گئی۔ وہ آنسو صاف کر کے لیٹ گئی۔ منصور کی محبت دل کے

گوشے گوشے میں سرسرا لے لگی تھی۔ وہ آپ ہی آپ سوچنے لگی۔ میں نے
کتنی سخت بات کہہ دی۔ اور منصور کا ٹھپڑ۔

کچھ ہی دیر بعد وہ سکون سے سو گئی۔ اس ٹھپڑ نے اسے تسکین دے
دی تھی۔

اور ادھر منصور بے حد پریشان تھے۔ اور اپنے آپ کو دنیا بھر کا
ذلیل ترین انسان تصور کر رہے تھے۔

تمو کو ٹھپڑ۔ وہ ایسا سوچ بھی نہ سکتے تھے۔ لاشعوری طور پر ان سے
یہ حرکت سرزد ہو گئی تھی۔ وہ اپنی محبت کی توہین برداشت نہ کر سکے تھے۔
ورنہ وہ تو ان دو دن میں یہ محسوس کرنے لگے تھے کہ وہ نمو ہی ہے جس کے
لئے ان کی روح پیاسی تھی۔

نہ جانے کب صبح ہوگی۔ وہ ناشتہ کیے بغیر اسپتال چلے گئے۔

تمو جب اٹھی تو چچی حیران سی نگاہ سے کہہ رہی تھی۔

منصور تو صبح ہی صبح چلے گئے۔ ناشتہ بھی نہیں کیا۔

شاید کوئی ضروری کام ہو۔ منجھ لے کہا۔

مگر وہ جاتے نہیں۔ آج تو کہہ کر بھی نہیں گئے۔ رشیدہ بولیں۔

پتہ نہیں۔ یہ باتیں سن کر نمو بے چین ہو گئی۔ بغیر ناشتہ کئے ہوئے۔

میں پاگل ہوں۔ کیا کیا کہہ گئی جذبات میں۔

وہ آپ ہی آپ کام کرنے لگی۔ رشیدہ بھی چپکی ہو رہی ہیں۔
 سارا دن گزر گیا۔ منصور گھر نہ آئے۔ سب کو ہی بے چینی تھی خصوصاً
 تم کو تو بہت زیادہ۔ شفیق الرحمن سہ پہر کے وقت جب چائے پینے لگے رشیدہ نے کہا
 اے تم ہسپتال ہی چلے جاتے۔ پتہ انہی تک نہیں لوٹا۔ ابھی جاتا ہوں۔ مجھے خود
 فکر لگی ہے۔

(۱۸)

تم کو بار بار مایوسی چاہا کہ وہ منصور سے بات کرے۔ مگر ہر مرتبہ گھٹ کر
 رہ گئی۔ سچہ منصور کے کمرے میں گئی تو وہ اپنے پلنگ پر لیٹے ہوئے تھے۔
 اُسے دیکھ کر اٹھ بیٹھے۔

آپ کی طبیعت خراب ہے کیا۔
 نہیں تو۔ یونہی تھکا گیا ہوں۔
 تو پھر نہ لیجیے۔

ہاں نہا لیتا ہوں۔ وہ بچوں کی طرح اس کی خمرے برداری کرنے لگا۔
 پھر باہر چلتے ہیں۔
 باہر۔

ہاں چلے۔ امتحان ختم ہو گئے ہیں طبیعت کچھ گھبرائی ہوئی تھی۔
 اچھا۔ چلے چلیں گے۔
 اور سچہ خوشی خوشی تیار ہونے چلی گئی۔

وہ یہی باتیں کر رہے تھے کہ منصور دروازے سے داخل ہوئے۔
 بسم اللہ۔ کہاں تھے بیٹا۔ رشیدہ اُسے دیکھتے ہوئے بولیں۔
 ہسپتال آپریشن تھا ایک ضروری۔ اس لئے صبح ہی چلا گیا۔
 میں تو ٹہری پریشان تھی۔ ابھی تمہارے خال کو ہسپتال بھیج رہی تھی۔
 رشیدہ اس کے کندھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولیں۔ میں معافی چاہتا ہوں۔
 تم نے سب کو پریشان کر دیا۔ شفیق الرحمن بولے۔

”سچہ جاؤ۔ چائے لے آؤ منصور کے لئے۔“
 اسی وقت تم کو ٹرے لے کر خود ہی آگئی منصور کی پریشانی چہرے سے
 عیاں تھی۔ تم کو کچھ فہر مندہ سی ہو گئی۔

ٹرے سامنے رکھ کر وہ پھر واپس چلی گئی۔
 منصور اسے دیکھ کر پھر پریشان ہو گئے۔ انھیں بھینٹ یاد آگیا۔ اور پھر وہ
 آرام کرنے کے لئے کمرے میں چلے گئے۔

اسور ہے۔ اور میری زندگی بھی تو ایک روگ ہے۔ ایک رشتہ ہوا اسو
 ہے۔ پھر کیوں نا ایک عجیب سا خیال اس کے ذہن میں آیا۔ سسک سسک کر
 جینا ہی تو زندگی ہے۔ اس کے کان میں پھر کسی نے کہا واقعی اس لذت کو
 کوئی کیا جائے۔ یہ نہیں ہی جانتی ہوں۔
 مگر محبت۔ کیا منصور ہی میری زندگی بن سکتا ہے۔ مگر وہ لڑکی
 اور کے دامن کا پھول ہے۔

قسمت کی یہ سیاہ سنجی دیکھو۔ اگر محمد بد نصیب کو محبت ملنے لگی تو وہ
 بھی کہاں منصور کے ساتھ۔ جسے جیتے جی کوئی برداشت نہ کر سکے گا۔
 منصور کی ماں اور رشتہ بہنیں ہیں۔ کیا کبھی بہنیں بھی چھوٹ سکتی ہیں میری
 اس محبت کو سماج برداشت کر سکے گا۔ مجھے یہ اصول راس آسکیں گے۔
 میں احتیاط کروں گی۔ نہیں میں منصور سے محبت نہیں کروں گی۔ اس کے
 کان میں کوئی زور سے ہنسا۔

پنگی۔ محبت کی جاتی ہے یا ہو جاتی ہے۔ سنجے منصور سے محبت ہو گئی
 ہے۔ ہاں تو اسے چاہئے لگی ہے۔ ہاں سنجے اس سے محبت ہو گئی ہے۔
 اُسے یوں لگا۔ جیسے ہارچی خانے کی ہر گچی، برتن۔ مسالے کے ٹپے
 گھی کاٹین۔ آٹے کی بوری۔ چولے کی لکڑیاں اور انگارے سب ہی اس پر
 تھپتھپے لگا رہے ہیں۔ اور کہہ رہے ہیں۔

جب وہ کپڑے پہن کر باہر آئی تو نمونہ چاہتے ہوئے بھی اس سے
 پوچھ لیا۔

”کہاں جا رہی ہو سنجہ۔“

منصور اصرار کر رہے ہیں کہ باہر چلو۔ انہی کے ساتھ کہیں جا رہی
 ہوں۔ سنجہ نے اسے جالانے کے لئے ہنس کر یہ جملہ کہا۔
 اچھا۔ تمو جانے کے لئے کیوں کچھ سی گئی۔

منصور اور سنجہ اس کے سامنے باہر چلے گئے۔ وہ دیکھتی رہ گئی۔
 اس کے دل میں ٹیسس سی اٹھنے لگیں۔ اور اپنے اس درد پر وہ خود
 حیران تھی کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ سنجہ منصور کی منگیت ہے پس کیوں
 اس کے لئے سونج رہی ہوں مجھے کیا۔ مجھے کیوں اچھا نہیں لگ رہا۔
 سنجہ منصور کے ساتھ بولتی ہنستی ہے تو مجھے کیوں جلن ہوتی ہے۔
 اسے یوں لگا جیسے اس کے کان میں مولے سے کسی نے سرگوشی کی۔
 یہ ہی تو محبت ہے پنگی۔
 محبت۔

تو کیا یہ محبت ہے۔

نہیں نہیں۔ اگلے لمحے وہ کانپ سی گئی۔ میں اور محبت، بد نصیبی
 اور محبت۔ آگے میں کیا کم دکھی ہوں۔ کہتے ہیں محبت تو جان کا روگ ہے۔

تجھے منصور سے محبت ہو گئی ہے۔
تم اسے چاہتی ہو۔

وہ کاؤں پر ہاتھ رکھ کر بڑبڑانے لگی۔
ہنیں۔ ہنیں۔

خیمے اور مہنیاں پھر اسے جھنجھوڑ گئیں۔
تب وہ آہستہ آہستہ بڑبڑانے لگی۔

اگر ایسا ہی ہے۔ تو ٹھیک ہے۔ مگر میں منصور سے بچوں گی اسے
کبھی احساس نہ ہونے دوں گی۔ اس کی محبت کو سینے سے لگائے پھر پی رہی
اور زندگی کا یہ دیا ایک دن مجھ جائے گا۔

وہ کام کرتی رہی۔ رشیدہ اور شفیق الرحمن کھا کر سو چکے تھے۔
گلو بھی اپنا جینٹل سا بستر لے کر جا چکا تھا۔ اماکب کی گھر جا چکی تھی۔
ایک نمونہ جو باہر پانی کے گھڑوں کے پاس کھڑی ڈیوڑھی پر نظرین جمائے
ہوئے تھی۔

کتنی دیر بیت گئی۔ نجمہ اور منصور آ گئے۔ وہ تخت پوش پر بیٹھ گئے
ان کی دبی دبی آوازیں تھو کے دل میں ضربیں لگا رہی تھیں۔
میں تو خفاک گئی۔ نجمہ نے کہا۔

تم نے ہی تو کہا تھا کہ پیدل چلتے ہیں ٹیکسی لے لیتے۔ منصور پہلے۔

ہیں۔ موسم بہت پیارا تھا۔ چاندنی تھی۔

ہاں۔ موسم تو بہت ہی اچھا تھا۔
کیا ٹائم ہو گیا۔؟ نجمہ نے پوچھا۔

ساڑھے بارہ بج گئے ہیں۔

اچھا۔ اماں وغیرہ تو سب سو گئے ہیں۔ کھانا مجھے ہی نکالنا
پڑے گا۔ اور اسی لمحے تھو آگے بڑھی۔ وہ آہستہ سے بولی۔

کھانا یہیں لے آؤں؟

منصور چونک اٹھے۔ اور عجیب سی نظر اس پر ڈال کر رہ گئے۔
ارے تم جاگ رہی ہو۔ میں سمجھی مجھے ہی کھانا گرم کرنا پڑے گا۔
نجمہ ہنس کر بولی۔

میرے جیتے جی تو ایسا نہ ہوگا۔ البتہ مرنے کے بعد۔ تم بھیک
سی ہنسی ہنس دی۔

اور اس فقرے نے منصور کے دل پر گہرا اثر کیا۔

کھانا یہیں لے آؤ۔ نجمہ نے بات جلدی ختم کرنے کے لئے کہا۔
نمو کھانا گرم کر کے لے آئی۔

کھانے کے بعد وہ جلدی ہی اپنے کمرے میں چلے گئے۔ منور بن سمیٹ کر
اپنے بستر پر آ پڑی۔

اور منصور اپنے کمرے میں پہنچ کر سوچ میں پڑ گئے۔
 ”کیسی عجیب لڑکی ہے یہ۔“
 ”طنز بھی خوب کرتی ہے یہ۔“
 دل بھی خوب جلاتی ہے۔
 روتی بھی خوب ہے۔
 ڈرتی بھی خوب ہے۔
 اور مظلوم بھی جی بھر کر ہے۔
 رکتی خوبیاں ہیں اس لڑکی میں۔
 رکتی خوبیاں؟

(۱۹)

لگے دن منصور اور رشید بیگم کے نام دو خط آئے تھے فہمیدہ بیگم نے سب کو بلا بھیجا تھا۔ ناہیدہ بچپن سے اپنے بھوپھی زاد کے ساتھ منسوب تھی۔ اور وہ لوگ نکاح کے لئے کہہ رہے تھے۔ منصور کے ساتھ انھوں نے صلاح کر لی تھی۔ اور تاریخ مقرر کرنے کو اب لکھا تھا۔
 قصہ یوں تھا کہ نکاح اب ہو رہا تھا۔ اور رخصتی منصور کے بیاہ کے ساتھ ہی لیکن منصور نے کہہ دیا تھا کہ فی الحال وہ ناہیدہ کی شادی کر دیں مگر پھر بھی رخصتی چھ ماہ بعد ہی رکھتی تھی۔ لہذا بھاگ دوڑ مچ گئی۔
 رشیدہ اور نجمہ بھاگ بھاگ کپڑوں کو کبسوں میں ٹھونسنے لگی تھی۔ فہمیدہ بیگم نے منیہ کے لئے خاص طور پر لکھا تھا کہ اسے ضرور ساتھ لایا جائے۔ رشیدہ کو تو یہ گوارا نہ تھا مگر بہن کے کہنے پر مجبور ہو گئیں اور
 نو سے کہہ دیا کہ وہ بھی اپنی تیاری کر لے۔
 نمونے پہلے تو انکار کر دیا۔

ہوا یوں کہ دس بجے کے قریب سب گھر کے افراد برآمدے میں بیٹھے تھے۔

موضوع گفتگو ناہید کا نکاح ہی تھا۔ منصور بھی تھے۔

شفیق الرحمن نے نموکو بلایا۔ اور کہا اپنی تیاری کر لے۔
”چچا میاں۔ میں کیا کروں گی جا کر؟۔ آہستہ سے بولی۔

”کیوں؟“

”گھر میں کون رہے گا۔؟“ متونے کہا۔

”میں جو ہوں۔

مگر۔ آپ کو تکلیف ہوگی۔ میں نہیں جاؤں گی۔

اسی لمحے متون کی نظر منصور پر پڑی۔ وہ بڑی التجا بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

رشیدہ اور نجمہ کو غصہ آ رہا تھا۔

نہیں بیٹی۔ تمہیں ضرور جانا ہے۔ یہ میرا حکم سمجھو۔

تمو خاموشی سے چلی گئی۔ اور اپنے چند سادے سادے کپڑے ایک بکس میں رکھ لئے۔ اسے بار بار منصور کی وہ التجا بھری نظریں یاد آ رہی تھیں۔
”کتنی آرزو تھی۔ کتنی التجا تھی۔

وہ مسکرا دی۔

سارا دن تیاری میں گزار گیا۔

رشیدہ راستے کے لئے ناشتہ اور کھانا تیار کر رہی تھیں منصور ہسپتال سے

چھٹی لے آئے تھے۔

گاڑی رات آٹھ بجے چلتی تھی۔ گھر میں بھاگ دوڑ مچی ہوئی تھی۔ رشیدہ کبھی لوگیاں دیکھ رہی تھیں۔ تو کبھی زیورات کی تلقین کر رہی تھیں۔ نموکا زیورات انہوں نے لے لیا تھا۔ نجمہ کے خوب بھاری بھاری کپڑے رکھوائے تھے۔

ہر کمرے میں انہوں نے تانے ڈالے۔ صرف ایک کمرہ شفیق الرحمن کے لئے رہنے دیا۔ اور باقی گھر کی چابیاں ان کے حوالے کیں اور گھر کو تاکید کرتے ہوئے وہ رخصت ہوئیں۔ سات بجے یہ اسٹیشن پہنچے۔

منصور کو یہ سفر نہ جانے کیوں دلچسپ لگ رہا تھا۔ نموکا ایک طرف کو الگ الگ سی اُن کے ساتھ تھی۔

گاڑی ابھی تک نہیں آئی تھی۔ منصور اسٹیشن پر ٹہل رہے تھے۔ تمو رشیدہ اور نجمہ ویشنگ روم میں تھیں۔

منصور ویشنگ روم کے قریب آکر بولے۔

”خدا جان چائے پیئیں گی یا شربت۔؟“

بیٹا رہنے دو آب چائے کا بکھیرا۔

نہیں خالہ ابھی وقت ہے۔

تو پھر چائے ہی ٹھیک ہے۔

منصور چائے کا آرڈر دینے چلے گئے کچھ دیر بعد بیرا چائے لے آیا۔

”ہاں بیٹا۔ تمہاری جگہ کیسی ہے؟“ رشیدہ نے پوچھا۔
وہاں زیادہ رش ہے۔ خیر بیٹھے کی جگہ تو ہے۔ منصورہ نمو کی طرف
دیکھ کر بولے۔

گاڑی نے سبز جھنڈی لہرائی اور منصورہ اپنے ڈبے کی طرف چلے
گئے۔ تھوڑی دیر میں گاڑی رینگنے لگی۔

جلدی ہی سچم نے ان دو لڑکیوں کو اپنے سے بے تکلف کر لیا۔
وہ ان کے ساتھ باتوں میں لگ گئی۔ رشیدہ سیٹ پر لیٹ گئیں۔
اور نمو باہر خلاؤں میں دیکھنے لگی۔

موسم اب گلابی ہو گیا تھا۔ گرمی بھی زیادہ نہ تھی۔ اور سردی بھی نہ
تھی۔ چھوٹے بڑے کئی اسٹیشن آتے رہے۔ ایک اسٹیشن پر ان
سب نے رات کا کھانا کھایا۔

منصورہ بھی اپنا کھانا نے گئے۔
رات کے گیارہ بج گئے۔

سچم چادر اوڑھ کر اوپر کی تختہ پر جا لیٹی اور رشیدہ یہاں نیچے پڑ
ہی۔ نمو بیٹھی رہی۔ اس نے وقت گزارنے کے لئے میگزین اٹھا لیا۔
اور کئی افسانے میں کھو گئی۔

ٹرین کی رفتار میں تیزی آگئی تھی۔ باہر رات بھاگ رہی تھی۔

سچم نے سب کے لئے چائے بنائی۔ منصورہ بھی وہیں کھڑے ہو کر
وہ بار بار نمو کی طرف دیکھ رہے تھے۔ کانے برقعے میں وہ بہت
لگ رہی تھی۔

باہر قلی نے آواز دی۔

گاڑی آ رہی ہے۔

رشیدہ نوکھرا کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔

آپ اطمینان سے چائے پیئیں۔ حالہ جان ابھی تو گاڑی آدھ گھنٹہ
گی۔ منصورہ بس کر بولے۔

”نہیں بیٹا۔ اب تو میں پی چکی۔ چلو لڑکیو۔ جلدی کرو۔“

منصورہ نے انھیں لیڈیز رائیں جا کر بٹھایا۔ چھوٹا سا کپار ٹنٹ تھا
زیادہ رش بھی نہ تھا۔ ایک سیٹ پر ایک بڑھیا کا قبضہ تھا۔ اور دوسری
دو نوجوان لڑکیاں تھیں۔ سامان وغیرہ رکھوا کر رشیدہ نے بار بار
گئے۔ اور پھر اطمینان سے بیٹھ گئیں۔

سچم نے برقعہ اتار دیا۔

”تم بھی اتار دو برقعہ۔“ رشیدہ تم سے کہنے لگیں۔

منصورہ پھر کھڑکی کے پاس اکھڑے ہوئے۔

”حالہ جان آپ کی جگہ ٹھیک ہے نا۔“

بس یونہی - آپ کیوں نہیں سوئے - نموتہت کر کے پوچھ بیٹھی -
نہند نہیں آرہی - منصور نے اسی طرح کہا -

”کیوں - ۹“

بس یونہی -

نہ جانے کیوں نموتہت پڑی - منصور بھی ہنس دیے -

”تم نے مجھے معاف کر دیا - ۹“ منصور کے لہجے میں ندامت تھی -

نموتہت لمحے اسے دیکھتی رہی اور پھر بولی -

نہیں -

میں شرمندہ ہوں - میں نے زیادتی کی تھی - مجھے کیا حق تھا بھلا -

وہ صرف مسکرا دی -

”بولونا - معاف کر دیا مجھے - ۹“ منصور کے لہجے میں بے پناہ پیار تھا -

جی - وہ اس کے لہجے کی تاب نہ لاسکی - اُسے یوں محسوس ہو رہا تھا -

جیسے اس کا حلق خشک ہو رہا ہے - اور زبان بند ہو گئی ہے -

”بولونا - ۹“

جی - مجھے تو کوئی شکایت نہیں - وہ بمشکل کہہ سکی -

”نمو - ۹“ منصور کی آواز شدت جذبات سے تیز ہو گئی -

جائیے - نمو نے سوئی ہوئی رشیدہ کی طرف اشارہ کیا -

دو گھنٹے گزر گئے -

کاظمی ایک اسٹیشن پر رُکی - نموباہر دیکھنے لگی -

کچھ مسافر اترے - کچھ بڑھنے لگے -

اجانک اُس کی نظر سامنے کھڑے منصور پر پڑی - جو دیر سے اُسے

دیکھ رہے تھے -

وہ کچھ حینپ سی گئی -

منصور قریب آگئے - وہ ڈر کر رشیدہ کو دیکھنے لگے - جو کروٹ بدلے

ترائے بھر رہی تھیں - کپار ٹنٹ کی ساری عورتیں سوئی ہوئی تھیں -

وہ اس کے بالکل قریب آگئے -

اُس نے پھر پلکیں جھپک جھپک کر اُسے دیکھا

وہ والہانہ نظریں -

وہ بُری طرح گھبرا گئی -

خالہ جان سو گئیں کیا - منصور آہستہ سے بولے -

جی - وہ کپکپاتی ہوئی آواز میں بولی -

”آپ نہیں سوئیں - ۹“

نہند نہیں آرہی -

”کیوں - ۹“

اچھا۔ گاڑی بھی دسل دے رہی ہے۔ اگلے اسٹیشن پر آؤں گا۔ وہ تیزی سے اپنے ڈبے کی طرف چلا گیا۔

گاڑی چل پڑی۔

تمو ان خوشگوار لمحوں کا تصور کر کے آپ ہی آپ مسکرا رہی تھی۔ اُن کھڑکی سے باہر سر نکال کر دیکھا۔

منصور اپنے ڈبے کے دروازے پر کھڑا سگریٹ پی رہا تھا۔ اندھیرے میں سگریٹ کی چمکاری اُبھرا اُبھر کر مدھم پڑتی رہی۔

اُس نے اپنا سر اندر کر لیا۔ اور اسٹیشن کا انتظار کرنے لگی۔ منصور بھی اسٹیشن کا انتظار کر رہا تھا۔

اور پھر تقریباً آدھ گھنٹے بعد ایک اسٹیشن آیا۔ اسٹیشن دیہاتی تھا۔ اور گاڑی صرف دو منٹ کھڑی ہوتی تھی۔

منصور جلدی جلدی آگئے۔

”تمو۔“ وہ آہستہ سے پکارے۔

جی۔

نہیں تو نہیں آرہی۔

نہیں۔ اُس کی آواز شرم میں ڈوبی ہوئی تھی۔

کچھ دن سے میں محسوس کر رہا تھا کہ میں دنیا کا ذلیل ترین انسان ہوں۔

”کیوں؟“

”تمہیں تھپڑ جو مارا تھا۔“

آپ۔ اس تھپڑ کو کیا جانیں۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی کہہ گئی۔

”کیا؟“ منصور کے لئے وہ حیرت کن بات تھی۔

جی۔ وہ جی پر زور دیتے ہوئے کہنے لگی۔

اس لمحے منصور کو یوں معلوم ہوا جیسے فضا منور سی ہو گئی ہے۔ وہ

بگڑیدتے ہوئے بولے۔

میں سمجھا نہیں۔

مجھے سمجھا نہیں آتا۔ مگر یہ سمجھا نا ضرور ہوگا۔

نہ جانے کیوں۔ مجھے اس تھپڑ نے زندگی میں پہلی مرتبہ سکون بخشا تھا۔

وہ رکتے ہوئے کہہ بیٹھی۔

منصور اسے عقیدت سے دیکھنے لگے۔ اس لمحے تمو کی محبت سے ان کا

لجک کا اٹھا۔

گاڑی رنیکے لگی۔ اور منصور دوڑتے ہوئے اپنے ڈبے پر سوار ہو گئے۔

میں منٹ بعد اگلا اسٹیشن آگیا۔

منصور کیلے ہمدردی لائے۔ وہ بڑی چاہت سے لفافہ تھامے آگے

بڑھے مگر رشیدہ بیگم کو بیٹھے دیکھ کر کچھ ڈر سے گئے۔

رشیدہ بان بنا رہی تھی۔ اور منو سیٹ پر سر رکھتے لوں پڑی تھی جیسے کافی دیر سے سو رہی ہے۔

خالہ جان۔ یہ کیلے۔ وہ بادل ناخواستہ بولے۔

”ارے بیٹے۔ سوئے نہیں ابھی۔“

سورہاتھا۔ ابھی جاگا ہوں۔

منصور کی نظر نوپڑی۔ جو ایک آنکھ کھولے۔ اس کی طرف دیکھ رہی تھی وہ زور سے ہنس دیے۔

”کیوں بیٹا۔“

”خالہ۔ آپ قیند میں بھی بان کھاتی ہیں۔“

اے بیٹا۔ نہیں ذرا آنکھ لگ گئی تھی۔

منصور نے منو کا منہ چڑا دیا۔ اور اپنے ڈبے کی طرف چلا گیا۔

(۲۰)

اسٹیشن پر منصور کے والد اور منشی جی موجود تھے۔ گاڑی صبح صبح پہنچی تھی۔ ابھی ہر طرف دھند چھائی ہوئی تھی۔ کہیں ڈوبا ہوا سویرا نمودار ہو رہا تھا۔

منصور کے والد اپنی بادن ماڈل موٹر لائے تھے۔ یہ موٹر چاہے ہمینہ کے دس دن گیراج میں گزار دی تھی۔ مگر پھر بھی منصور کے والد کے کام ضرور آتی تھی۔ وہ سب جب گھر پہنچے تو فہمیدہ بیگم اور ناہیدہ انتظار میں تھیں وہ سب ایک دوسرے سے لپٹ گئیں۔ نجمہ سے ہٹ کر ناہیدہ منو سے یوں لپٹی جیسے مدتوں کی بچھڑی ہوئی ہو۔ منو نے فہمیدہ بیگم کو سلام کیا۔ فہمیدہ بیگم نے اُسے سینے سے لگایا۔

اتنی ہم بھی کھڑے ہیں۔ منصور ہنس کر بولے۔

ارے تمہیں بھول سکتی ہوں کہیں۔ وہ جھٹ پٹ بیٹے کی پیشانی چومنے لگیں۔ فہمیدہ بیگم کی نوکرانی خنثت ان لوگوں کا سامان منشی جی کی مدد سے اندر رکھوا رہی تھیں۔ ناہیدہ منصور سے لپٹ گئی۔

منصور اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے۔
 ”اب خیال آیا ہے بھائی کا۔“

ناہیدہ سن دی۔

اے چلو۔ ناشتہ ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ فہیدہ بگم چلائیں۔

کھانے کا کمرہ سلیقے سے سجا ہوا تھا۔ وہ سب کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

مسرور احمد (منصور کے والد) رشیدہ سے شفیع الرحمن کا حال پوچھنے لگے۔ اور باقی لوگ ہنسی اور باتوں میں ناشتہ کرنے لگے۔ منصور نے دوا یک مرتبہ نموک کی طرف دیکھا جو بے وجہ جھینپ رہی تھی۔ ناہیدہ اسے اصرار سے ہر چیز کھلا رہی تھی۔ اور تجربہ جی بھی ان دونوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔

ناشتے کے بعد ناہیدہ ان کو کمروں کی طرف لے گئی۔ رشیدہ بگم اور نجمہ کا انتظام ایک ہی کمرے میں تھا۔ تنو کا پلنگ ناہیدہ نے اپنے کمرے میں پہلے سے بچھوایا تھا۔ حشمت سے اُنھوں نے کہہ دیا تھا کہ نمو سے پوچھ کر اُس کا سامان بھی وہیں لے جائے۔

منصور تو اپنے ہی کمرے میں چلے گئے تھے۔ اُن کا کمرہ فہیدہ بگم اور مسرور احمد کے کمرے کے ساتھ ہی تھا۔

رشیدہ بہن کے پاس بیٹھ گئی۔ اور اگلی پچھلی باتیں دوسرے لگائیں۔ منصور اپنے پلنگ پر لیٹ گئے۔ نجمہ بھی پلنگ پر جا کر لیٹ گئی۔

ناہیدہ رات کو بیٹھی باتیں کرنے لگیں۔

ہائے شکر۔ تم آگئی نمو۔ میں تو ڈر رہی تھی کہ شاید خالہ جان تمہیں نہیں لائیں گی۔ میں تو نہیں آ رہی تھی۔ چچا نے زبردستی بھجیا ہے۔

”کیوں؟“ کیا تمہارا دل نہیں ملنے کو نہیں چاہتا تھا۔ ناہیدہ شکایتاً بولی۔ کیوں نہیں چاہتا تھا مگر۔

مگر وہ کچھ کہیں۔ میں سمجھ گئی۔

”کیا سمجھ گئیں؟“

یہ ہی کہ تمہیں مجھ سے ذرا بھی محبت نہیں۔

نہیں ناہیدہ ایسی بات نہیں۔ جانے مجھے کیوں محسوس ہوتا ہے کہ لوگ کچھ کہتے ہیں سچ ہی کہتے ہیں۔

کیا۔ ناہیدہ نے پوچھا۔

یہی۔ کہ۔ میں۔ محسوس۔

اور اگلے لمحے ناہیدہ نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

کیسی باتیں کرتی ہو۔

میں چاہتی تھی کہ آؤں۔ لیکن مجھے اپنے سخت سے ڈر تھا۔

بس اب چپ ہو جاؤ۔

نہیں ناہیدہ۔

اے میری بگلی بہن۔ یہ وہم سب لوگوں کے پیدا کردہ ہیں۔ کوئی منجور نہیں۔ یہ جہالت ہے۔ غم کبھی بھی ایسا مت سوچا کرو۔ جب تم خود اپنے لئے ایسا سوچتی ہو تو لوگ کیا کہتے ہوں گے۔ خدا ناراض ہوتا ہے۔ ایسا کبھی نہ سوچا کرو۔

منو کے دل کو نہ جانے ناہید کے ان چند الفاظوں نے کیا کیا سمجھا دیا۔ تم اب سو جاؤ۔ تھکی ہوئی ہو۔ آنکھیں کیسی سرخ ہو رہی ہیں۔ کیا رات سوئی نہیں ہو۔

اس جیسے نے منو کو رات کا جاگنا یاد دلادیا۔ وہ کھوس گئی۔

غم آرام کرو۔ میں ابھی آتی ہوں۔ کہتے ہوئے ناہید تنہی ہوئی باہر نکل گئی اور نموبستر پر لیٹ گئی۔

ناہید کا گھر کتنا اچھا تھا۔

مسرور احمد کا کام اچھا چلتا تھا۔ مگر تھے ذرا کنجوس سے۔ اُن کا یہ بنگلہ نا گھر بڑا خوبصورت تھا۔

اوپر کی منزل پر چاہ کمرے تھے۔ ڈرائنگ روم الگ تھا۔ کمروں کے آگے برآمدہ۔ اور پھر بڑا سا پتئی اینٹوں کا ہموار صحن برآمدے کی سیڑھیوں پر سرخ اور زرد رنگے۔ جن میں انگریزی پھول بہت بھلے لگ رہے تھے۔

یہ کون سا سنت اور سکھ پڑن کی گواہی دیتا تھا۔ گھر میں ایک طرف کچن تھا۔

گھر میں صرف ایک ہی نوکرانی تھی۔ حشمت اور منشی جی تو خیر بہت پرلے آدمی تھے۔ بازار سے سودا سلف وہی لایا کرتے تھے۔ اور حشمت کے ساتھ سودا پرچہ نہیں بھی ہوا کرتی تھیں۔

منو تھکی ہوئی تو تھی۔ پڑتے ہی سو گئی۔

ناہید ایک مرتبہ آئی۔ اُسے سوتا دیکھ کر واپس چلی گئی۔ اور حشمت کے ساتھ کھانے کا انتظام کرنے لگی۔

نور ضیہ بیگم بیوہ ہو گئی تھیں۔ پھر وہ بیٹے کو پالتی رہیں۔ قیوم کے والد نے بیوی اور بیٹے کے لئے کافی جائیداد چھوڑی تھی۔

رضیہ بیگم منصور اور ناہید کی اکلوتی پھوپھی تھیں۔ دونوں کو بہت چاہتی تھیں۔ اپنی بھائی سے بھی اُنھیں بڑا پیار تھا۔ بھائی کے لئے جان دیتی تھیں۔ قیوم بی۔ اے کر چکے تھے۔ لیکن ماں نے نوکری نہ کرنے دی۔ کتابوں کی بہت وسیع دوکان تھی۔ کئی نوکرا کام کرتے تھے۔ اور شہر کی مانی ہوئی دوکان تھی۔ ماسٹریس۔

بجھنے لے دو ایک مرتبہ قیوم کو دیکھا تھا۔ گراب دو سال سے بالکل نہ دیکھ سکی تھی۔ اس وقت وہ اُسے چھوڑ رہی تھی۔

قیوم بھائی سے پردہ کرتی ہونا تم تو۔ بجھنے لے پوچھا۔ تمہاری طرح نہیں ہیں۔ ابھی سے منصور بھائی کے ساتھ گھومتی ہو۔ ناہید نے فوراً کہا۔

اور اس جملے نے منو کے سینے میں ایک چٹھن سی پیدا کر دی۔ اور کیا۔ وہ تو ہمیں خود گھماتے ہیں۔ بجھنے ڈھٹائی سے سننے لگی۔ اچھا تو قیوم بھائی سے پردہ ہوتا ہے، سن ناہید کا۔ نموبات کا موضوع بدلنے کے لئے جلدی سے بولی۔ ناہید شرمائی گئی۔

(۲۱)

دوپہر کے کھانے کے بعد سب کھانے کے کمرے میں ہی بیٹھے رہے۔ اور باتیں ہونے لگیں۔ فہمیدہ، رشیدہ کو ناہید کے نکاح کا پروگرام بتانے لگی۔ اس لئے ناہید وہاں سے اُٹھ آئی۔ اس کے پیچھے ہی منو اور بجھ بھی چلی گئیں۔ تم آکیوں گئیں۔؟ بجھ نے اس کے کمرے میں پہنچ کر اُسے چھیڑا۔ یونہی۔ وہ مسکرا کر بولی۔

بے چاری کو شرم آگئی۔ منو ہنس چری۔ ہائے اللہ۔ اماں کو بھی تو دیکھو۔ آبا اور بھائی جان کے سامنے ہی پروگرام بنانے لگیں۔

ناہید کے چہرے پر لالی سی پھوٹنے لگی۔ وہ دونوں وہیں بیٹھ گئیں۔

ناہید کے منگینے کا نام قیوم تھا۔ اور اس کی بہت بڑی کتابوں کی دوکان تھی۔ ویسے باپ کی جائیداد بھی کافی تھی۔ قیوم ماں کا ایک ہی بیٹا تھا۔ ناہید کی ساس رضیہ بیگم بڑی خلیق اور سہرہ د خاتون تھیں۔ قیوم جب دسویں میں تھا

تاک جھانک تو رہتی ہوگی۔ نجمہ نے کہا
جی نہیں۔ اللہ نہ کرے۔ ناہید نے جواب دیا۔
اچانک کمرے میں منصور داخل ہوئے۔
میں آجاؤں۔

آئیے بھائی جان۔ ناہید ایک طرف کو کھسکتے ہوئے بولی۔
”کیا عود ہے۔“
کچھ نہیں۔ یونہی باتیں۔ نجمہ نے ہنس کر کہا۔
کیسی باتیں۔

ناہید کہہ رہی تھیں کہ منگنی کے بعد منگیتر سے پرہیز کرنا چاہیے۔
تمہارا خیال ٹھیک ہے منصور نے کہا اور نجمہ کا چہرہ خوشی سے سُرخ ہو گیا
میں تو اپنی بیوی کو پرہیز نہیں کراؤں گا۔ منصور نمود کو گھور کر بولے۔
نمود بڑی طرح گھبرا رہی تھی۔ نجمہ ہنس کر کہنے لگی۔
اب آپ شرموع ہی ہوئے۔ آگے آپ کی بیوی اڑکار کر دے تو
وہ اڑکار نہیں کہے گی۔ منصور کی نظریں نمود پر تھیں۔
نجمہ زور سے ہنسنے لگی۔ منصور نے نمود

آپ بھی کوئی بات کیجیے۔ منصور نے نمود سے کہا۔
جی اچھا۔ وہ گھبرا کر بولی۔

اس جھلے پر سب ہی ہنس دیے۔
ہماری تو بڑی فرمانبردار پتی ہے۔ نجمہ نے کہا۔
وہ جھینپ گئی۔
شام کو کہیں چلے گا۔ بھائی جان۔ ناہید بولی۔
کہو تو ختم تینوں کو فلم دکھا لاؤں۔ منصور نے جواب دیا۔
ہاں۔ مگر اجازت کا سوال۔
آپ کہیں گے تو آماں مان جائیں گی۔ نجمہ نے کہا۔
اچھا تو پھر کریں گے کوشش۔ مگر خیال رہے۔ آبا کو پتہ نہ چلے۔
ہاں ہاں۔
منصور نے ایک مرتبہ پھر نمود پر میٹھی نظریں ڈالیں۔ وہ بھی منصور
کی طرف دیکھ رہی تھی۔ منصور کی نظروں کی تاب نہ لاکر اس نے
نظریں جھٹکا لیں۔
کچھ دیر باتیں ہوتی رہیں۔ منصور کا دل نہ چاہتا تھا کہ اٹھ کر جائے
مگر نجمہ کی بے نی باتوں نے اُنھیں پیرا کر دیا۔ اور وہ اٹھ کر چلے گئے
نمودا ناہید وہیں لیٹ گئیں۔ نجمہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ رشید
بھی پہنچ چکی تھیں۔
کہاں تھیں تم۔

ناہید کے پاس -

”وہ تیری کہاں ہے؟“

وہ بھی وہیں ہے -

میں تو نہیں چاہتی تھی کہ آئے مگر تمہارے آبا کو بھی خدا سمجھ
خیر اب کیا ہو سکتا ہے - خیال رکھنا کرو تم - منصور کا -

نہیں اماں وہ ایسے نہیں ہیں - ابھی ابھی باتیں کر رہے تھے -
میری بڑی تعریف کی ناہید کے سامنے - نجمہ شرماتے ہوئے بتانے لگی
ناہید تو نم سے جلتی ہے - چلو بلا ٹٹی - اور منصور تو میرے پاس ہی
رہے گا - نانا گھر میں دھیان اٹکا ہے میرا - رشیدہ پھر پولیس -
ہائے اماں - اب کچھ دن رہنا ہے -

نہیں بیٹا - منصور کی چھٹی صرف پانچ دن کی ہے اسے تکلیف
جانا تو پڑے گا ہی -

”نکاح کب ہے -؟“

پرسوں -

اچھا تو پھر رخصتی -

دو ہی ماہ بعد ہوگی -

دونوں ماں بیٹی تھوڑی دیر باتیں کرتی رہیں -

شام چائے کے بعد منصور نے ماں سے کہا -

اماں - یقیناً میرے پیچھے بڑی میں فلم دکھاؤ -

اے بیٹا - کوئی غفل کی بات کرو - فہمیدہ میگم نے کہا -

کیوں کیا ہوا -

ناہید نہیں جاسکے گی - تین دن تو رہ گئے ہیں نکاح میں ہمارے
ہاں تو ہیتہ پہلے لڑکی کہیں آتی جاتی نہیں -

اماں چھوڑیے یہ ٹپرائی رسمیں - منصور بولے -

نہیں بیٹا -

اے آپا رہنے بھی دو - اب جاؤ بیٹا لے جاؤ - رشیدہ بیگم لے -
منصور کی حمایت کی -

میری خالہ کتنی اچھی ہیں - منصور رشیدہ کے گلے میں ہاتھیں ڈال کر
بولے - اور وہ اسے پیار کرتے ہوئے ہنسنے لگیں -

ناہید اور نجمہ کھڑی تھیں - منصور کو آنا دیکھ کر بولیں -

دل گئی اجازت -

بڑی مشکل سے ملی ہے - اب تیار ہو جاؤ -

ناہید اور نجمہ اپنے اپنے کمروں کی طرف چلی گئیں -

ناہید نے نمونہ کو زبردستی اچھے کپڑے پہنائے - نجمہ ساڑھی پہن کر

خود ہی بولے۔ باری نجمہ سے شروع ہوتی ہے۔ ہاں تو نجمہ تباؤ۔ تمہیں کون سے ایکٹر پسند ہیں۔

نجمہ جلدی سے بولی۔

انڈیا میں۔ مینا کمار ہی اور پردیپ کمار۔ پاکستان میں صبیحہ سنتوش۔ ناہیدہ، تم تباؤ۔ اب کے منصور نے ناہیدہ سے سوال کیا۔

مجھے انڈیا میں نرگس اور راجکپور۔ پاکستان میں تیرا اور سنتوش۔ اور آپ کو۔ منصور کی انگاہیں نمونہ پرجم گئیں۔

مجھے دلیپ کمار اور مدھو باللا۔

اور پاکستان میں۔ نیا میر محمد علی اور صبیحہ آپ بھی تو بتائیے۔ نجمہ منصور سے کہنے لگی۔

”مجھے بھی دلیپ اور مدھو باللا پسند ہیں۔ اور پاکستان میں اب تک کوئی نہیں۔ نجمہ جانے کیوں جل سی گئی۔

منصور نے پھر پوچھا۔

تمہیں مینا کمار ہی اور پردیپ کس فلم میں زیادہ پسند آئے۔ عدل جہانگیر میں۔ نجمہ نے کہا۔

اور تم ناہیدہ۔

بھئی مجھے تو برسات۔ آہ۔ اور بہت سی فلمیں ان کی پسند ہیں۔

آئی۔ ناہیدہ اور تم تو شلوار قمیض میں نہیں۔

منصور بھی آگئے۔ اور تینوں ٹیکسی لے کر سینما ہال پہنچے۔

فلم پر زیادہ ریش نہیں تھا۔

منصور تینوں کے ساتھ کس میں آگیا۔ بکس میں صرف دو ہی

صوفے تھے۔ نمودار ناہیدہ جب آگے بیٹھیں تو نجمہ جان کر کچھ صوفے پر بیٹھ گئی۔ منصور کو اس کے ساتھ بیٹھتے ہوئے بڑی کوفت ہوئی۔ وہ نمودار کی طرف غصے سے گھور کر رہ گئے۔ نمودار مسکرا دی۔

ناہیدہ بھی نجمہ پر حیران تھی۔

یکچر شروع ہونے میں ابھی پانچ منٹ باقی تھے۔

منصور نمودار سے کسی کے سامنے ابھی تک بات نہ کر سکے تھے۔ آج بہت کر کے بولے۔

آپ تو یکچر بہت کم دیکھتی ہیں نا۔

جی جی ہاں وہ نظریں جھجکا کر بولی۔

کوئی بھی نہیں۔ جب دادی آتاں زندہ تھیں تو ہمیشہ تم محلہ والی خالہ کی بیٹیوں کے ساتھ جایا کرتی تھیں۔ نجمہ ہنس کر بولی۔

ہاں دادی آتاں کے انتقال کے بعد نہیں گئی۔ نمودار نے جواب دیا۔ ویسے آپ کو کس کی ایکٹنگ اچھی لگتی ہے منصور نے پھر پوچھا۔ اور پھر

اور آپ۔

مجھے نرانا بڑی پت آئی تھی۔ تمواہستہ سے بولی۔

اور مجھے۔ سنگدل۔ منصورہ تم کو کی طرف دیکھ کر بولے۔

سنگدل تو بہت اچھی تھی۔ بچہ لے کہا۔

ہائے۔ اس کی بیوی کیسی ہوتی ہے۔ ناہید بولی۔

کتنی اچھی سٹوری تھی۔ منصورہ بولے۔

اور تم کو منصورہ کی نگاہیں کہتی ہوئی معلوم ہوئیں جیسے کہہ رہی ہو
نمو میری زندگی بھی تو ایسی ہی ہے۔ تم میری منجھو ہو۔ تم میری منجھو ہو۔

اور پھر ساری فلم اس کے سامنے گھوم گئی۔

راتنے میں فلم شروع ہو گئی۔

فلم خاصی تھی۔

سرگوشیاں ہوتی رہیں۔ فلم بھی دیکھی جا رہی تھی۔

انٹرول میں منصورہ نے سب کو آتش کریم کھلائی۔

وہ خود کافی دیر باہر رہے اور پھر واپس آکر چپ چاپ بیٹھ گئے۔

بقیہ فلم خاموشی میں ہی گزری۔ منصورہ بول رہے تھے کہ بچہ ان سے

کیوں سرگوشیوں میں باتیں کرتی ہے۔ منو کے کان بھی پیچھے لگے تھے۔ ناہید

بے پرواہ سی بیٹھی رہی۔

فلم ختم ہوئی تو وہ سب باہر نکلے۔ اسی لمحے قیوم کہیں سے آنکے منصورہ
کو دیکھ کر ادھر آ گئے۔ ناہید منو کے پیچھے چھپی جا رہی تھی۔

تمہیں کیا ہو رہا ہے؟ منو نے کہا

وہ قیوم بھائی جو ہیں۔ بچہ بولی۔

اچھا یہ ہیں قیوم بھائی۔ ماشاء اللہ بڑی خوب ہے۔ منو نے کہا۔

اب چپ بھی رہو۔ قیوم کی طرح زبان مت چلاؤ۔ ناہید دبی آوازیں لگائی۔

قیوم لڑکیوں کی طرف دیکھ کر مسکرا دیے۔

”کیسی پکڑنا۔ قیوم۔“ منصورہ بولے۔

وہ جلدی جلدی نیچے اتر گیا۔

ہائے اللہ۔ مجھے تو شرم آرہی ہے ناہید نے کہا۔

اچھا ہوا اس بہانے دیدار ہو گیا۔ بچہ بولی۔

چپ ہو جاؤ۔ کیا کہیں گے۔ کہ کل۔ ناہید نے فقرہ ادھورا

چھوڑ دیا۔

کل کیا؟ منو نے اسے چھیڑا۔

یہی کہ۔ وہ شرما گئی۔

پھر کیا ہوا؟ منو نے ہنس کر کہا۔

باتوں باتوں میں سب نیچے اتر آئے۔ قیوم نے ایک ٹیکسی روک لی۔

اور دروازہ کھول کر کھڑا ہو گیا۔

نمو کے ساتھ ہی ناہید جلدی سے گھسنے لگی تو برقعے کا نقاب ٹیکسی کے ٹوٹے ہینڈل سے اُلجھ گیا۔

قیوم نے مسکرا کر نقاب ہینڈل سے نکال دیا اور کہا گھبراہٹ میں ناہید شرم سے پانی پانی ہو گئی۔ وہ تقریباً نمو پر گر پڑی۔

نمو نے بھی یہ بات سن لی تھی۔
وہ اُسے چھیڑتے ہوئے بولی۔

آخر فقرہ جڑ ہی دیا۔

ہاں — دیکھو تو — اگر بھائی جان سُن لیتے۔ ناہید شرمائی ہوئی آواز میں بولی۔
کسی نے نہیں سنا۔ سنجہ بھی ذرا نا صبر پر کھڑی تھی۔

وہی نقاب اُلجھتا اُس نے دیکھ لیا تھا۔

نقاب بھی سہارا دیکھ کر اُلجھا تھا۔ سنجہ نے کہا۔

ناہید نے سر جھجکا لیا۔

قیوم نے ایک بار پھر اندر مسکرا کر دیکھا۔ اور منہ صبر سے ہاتھ ملا کر چلا گیا۔
ٹیکسی اشارت ہو کر چل دی۔ ناہید کا دل دھڑک رہا تھا۔ نمو اسے

چھیڑ رہی تھی۔ سنجہ باہر کھڑکی سے دیکھ رہی تھی۔ منصور شیشے میں نمو کو
ہنستا دیکھ کر منہس رہے تھے۔

(۲۲)

ناہید کا نکاح ہو چکا تھا۔

رسم تو بہت سادگی سے ادا کر دی گئی تھی۔ رات کا کھانا وغیرہ تھا۔
رضیہ بیگم ناہید کی ساس اپنے ساتھ چند عورتیں لائی تھیں۔ اور ناہید کو
نکاح کا سرخ جوڑا بھی پہنایا تھا۔ نمو نے اُسے سونے کے زیورات
کے علاوہ سفید پھولوں کا گہنا بھی پہنایا تھا۔

ناہید کا چہرہ اُس کی شخصیت کا آئینہ دار تھا۔ وہ بڑی معصوم اور
بھولی بھالی لڑکی تھی۔ اس لئے اس کے چہرے پر جیلانے ایک دکھائی پیدا
کر دی تھی۔

نمو اس کے قریب بیٹھی تھی۔ اور اس کے کالج کی دو چار سہیلیاں
بھی آئی ہوئی تھیں۔

سنجہ تو کبھی باہر اور کبھی اندر اپنے بھاری کپڑوں کو سنبھالے پھر رہی
تھی۔ نمو نے اور سنجہ رنگ کا سادہ سیوٹ پہن رکھا تھا۔ اور سادہ ہی دوپٹہ
اس کے حن میں ایک عجیب سی حسرت تھی۔ اُداسیاں تھیں۔

لڑکیاں ناہید کو چھیڑ رہی تھیں۔ ایک شوخ سی لڑکی نے منو کو دیکھ کر پوچھا۔

ناہید۔ یہ تمہاری بہو نے والی بھابی ہیں کیا۔
منو کا رنگ سرخ ہو گیا۔ اور ناہید اُداسی سے کہنے لگی۔
نہیں۔

اچھا۔ تو میں تو انھیں سمجھی تھی۔ بھٹی معاف کرنا۔
اور منو کا چہرہ پھر غمناک ہو گیا۔ کاش وہ لڑکی معافی نہ مانگتی۔ جو کہہ دیا تھا وہ رہنے دیتی۔

تجھہ ہلستی ہوئی اندر آئی۔ اور بولی۔
ناہید۔ تمہاری بھوپھی آہی ہیں تمہیں دیکھنے۔ ناہید کا سر جھک لڑکیوں نے اُس کا گھونگھٹ نیچے کر دیا۔ اسی لمحے رضیہ بیگم رشیدہ اور دوسری خواتین کے ساتھ کمرے میں آ گئیں۔

رضیہ بیگم نے ناہید کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا۔ اور گھونگھٹ سر کا ہر بلائیں لیں۔ اور پھر۔ اور پے اُس کے ہاتھ پر رکھ دیے۔

ناہید نے شرماتا کر بھوپھی کو سلام کیا۔

جیتی رہو۔ پھلو پھلو۔ رضیہ بیگم نے دُعا میں دیں۔ سب خواتین رضیہ کو مبارک باد دے رہی تھیں۔ اور رضیہ بیگم خوشی سے ہر ایک کو

واب دے رہی تھیں۔ دوسری آئی ہوئی خواتین نے بھی ناہید کو تحفے اور روپے دیے۔

کھانا کھا کر رضیہ بیگم مع ان خواتین کے جو ان کے ساتھ آئی تھیں علی گئیں۔ لڑکیاں بھی جا رہی تھیں۔
تجھہ تھکاوٹ کا کہہ کر اپنے کمرے میں جا چکی تھی۔

منو اور ناہید وہیں بیٹھی تھیں۔
فہمیدہ بیگم کہہ گئی تھیں کہ کپڑے بدل کر ناہید بھی اب سو جائے۔
ناہید نے منو سے کہا
میں کپڑے بدل لوں۔
ہاں۔ تجھے بھی بدلنے ہیں۔

اچھا پہلے میں بدل لوں گی۔ وہ اٹھ کر کمرے کے ساتھ والے غسل خانے میں گھس گئی۔

اسی لمحے کمرچے میں منصور داخل ہوئے۔
منو کو اُٹھوں نے سارا دن نہیں دیکھا تھا۔ کمرے میں لاسٹ چل رہی تھی۔ وہ منو کو دیکھ کر وہیں کھڑے ہو گئے۔

منو نے چونک کر دیکھا تو گھبرا گئی۔ منصور اسی کو دیکھ رہے تھے۔
وہ ہی بے تاب نظر میں۔

وہ ہی والہانہ پن۔

وہ ہی بے نابیاں۔

اُس کا دل بُری طرح دھڑکنے لگا۔ وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

ناہید کہاں ہے منصور کو پہنچنے لگے۔

وہ۔ وہ۔ تمونے غسل خانے کی طرف اشارہ کیا۔

منصور مسکرا دیے۔ یونہی خواہ مخواہ۔

اور وہ بھی ہنس دی۔ ویسے ہی۔ بغیر کسی بات کے۔ اس کی یہ ہنسی

اس وقت منصور کو بہت اچھی لگی۔

وہ وہیں کرسی پر بیٹھ گئے۔ نمود و پے کو انگلی میں گھماتے ہوئے

کنکھیوں سے اُن کی طرف دیکھنے لگی۔

تم بھی واپس جاؤ گی کیا۔ اُنھوں نے دبی آوازیں پوچھا۔

اُس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

مَت جاؤ۔

”کیوں؟“

یونہی۔ کچھ دن تو چین سے گزارو۔

مگر

مگر کیا؟

آپ کی چھٹی بھی تو پانچ دن کی ہے۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی کہہ گئی۔
اور اپنے اس جملے پر وہ خود پانی پانی ہو گئی۔

تو کیا۔ تم چاہتی ہو کہ میں بھی رہوں منصور خوشی سے بولے۔

جی۔ نہیں تو۔ ہاں۔ میں۔ مگر اس سے کوئی بات نہ بن سکی۔

اچھا۔ اچھا۔ میں سمجھ گیا۔ وہ اس کی گھبراہٹ سے لطف اندوز

ہو رہے تھے۔

کیا سمجھ گئے۔ اُس نے بڑی بڑی آنکھیں کچھ غصے سے اٹھا کر کہا۔

سب کچھ۔

راتنے میں ناہید کیڑے بدل کر نکل آئی۔

وہ بھائی کو دیکھ کر شرماتا لگی۔

منصور اسے دیکھ کر ہنسنے لگے۔ اللہ کی شان۔

بھائی جان۔ وہ شرم سے آنکھیں جھکا کر چیخی۔

اچھا بھائی ہم کچھ نہیں کہتے۔

نمو بھی ہنس رہی تھی۔ منصور کہنے لگے۔

کہتے ہیں جو دہن کے ساتھ رہے اس کی شادی بھی جلدی ہو جاتی ہے

نمو جھینپ سی گئی۔

ناہید ہم لوگ چلے جائیں گے تو تمہارا دل نہیں لگے گا۔

منصور ایک تنگ کرتے ہوئے بولے۔

ہاں بھائی جان۔ بالکل نہیں۔

پھر کوئی صل سوچو۔

کیا سوچوں۔

کسی کو اپنے پاس رکھ لو۔

کسے رکھوں۔

خالہ جان سے منو صاحبہ کے لئے کہو۔ اور منو نے گھر اکراں کی طرف دیکھا۔

ہائے کاش خالہ جان۔ منو کو چھوڑ جائیں۔ کچھ عرصہ کے لئے۔

اتنی سے کہو۔

اچھا میں خالہ اور اتنی سے کہوں گی۔ وہ منو کا ہاتھ پکڑ کر بولی۔

منصور منہس کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

بیٹھے نا، بھائی جان۔ ناہید بولی۔

منصور تو بہانہ چاہتے تھے۔ فوراً بیٹھ گئے۔ اور بولے اگر اس وقت چائے لے۔ تو کتنی اچھی بات ہو۔

تو میں بڑا سے کہہ آتی ہوں۔ ناہید اٹھتے ہوئے کہنے لگی۔

میں جانتی ہوں کہنے۔ منو نے کہا۔

نہیں میں جانتی ہوں۔ اور اگلے لمحے ناہید باہر نکل چکی تھی۔

منصور اٹھ کر منو کے قریب چلے گئے۔

اُس نے گھر اکرا نکھیں بند کر لیں۔

میں واپس آ جاؤں گا۔ وہ اس کے قریب ہو کر بولے۔

کب۔ منو نے سرگوشی کی۔

بہت جلد۔

پھر وہ فوراً کھڑی ہو گئی۔

کیوں آئیں گے آپ واپس۔

تم جو چاہتی ہو۔

کوئی بھی نہیں۔

تھپڑ منصور نے ہاتھ اٹھایا۔

مارئیے۔ منو نے گال آگے کر دیا۔

اور منصور نے ہلکی سی چپٹ اس کے گال پر لگا دی۔

وہ بری طرح شرمائی گئی۔

منصور اس پر پرستش کی نظریں ڈالتے ہوئے کہنے لگے۔

منو۔ میں ان کو چھوڑ کر واپس آ جاؤں گا۔ فی الحال تمہیں بتاؤں گا

وہ وہ نجمہ صاحبہ بھی رہ جائیں گی۔

تو کیا ہوا۔ مہننے سے اس کے سفید دانت موتیوں کی طرح چمکنے لگے۔

میں ماروں گا اب تمہیں۔

وہ ہنس دی۔

نہو۔

جی۔

مجھ سے شادی کرو گی نا۔

ہیٹے۔!

بولو۔

اس کی آنکھیں مہسرت سے بند ہو گئیں۔ منصور جیسے ساتھی کے ساتھ زندگی گزارنے کا تصور کتنا حسین تھا۔ اور اگلے ہی لمحے اُسے اپنی سیاہ بختی کا احساس ہوا۔ جیسے منصور چاند ہے۔ اور وہ چکور۔ وہ کہاں منصور تک پہنچ سکتی ہے۔ اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

کیوں۔ بتاؤ نا

لیسے کیوں کر ہو سکتا ہے۔ اس کی آواز میں جہاں کی حسرتیں تھیں۔

یا بوسی گناہ ہے۔ مجھ پر بکھر دوسرے رکھو۔ میں نہیں ہر طرح حاضر صل کروں گا نہ تو۔

اور نہ عقیدت کی نظروں سے اُسے دیکھنے لگی۔ اسی لمحہ ناہید آگئی

میں چائے کا کہہ آئی ہوں۔
اچھا۔ مگر مجھے تو اب نیند آگئی ہے۔ چائے ملے اُٹ جائے گی۔
وہ کہتے ہوئے باہر نکل گیا۔
ناہید حیرت سے دیکھتی رہ گئی۔

نہیں مجھ تمہاری بات اور ہے۔ تم بے شک رہو۔ میری بیٹی ہو۔
میرا اختیار ہے۔ کسی کی بیٹی پر میرا کیا اختیار۔ رشیدہ نے پھر مخالفت کی۔
اچھا۔ تمہاری مرضی۔ کوئی زور نہیں ہے ہمارا۔ فہمیدہ بیگم چپ
ہو گئیں۔ اور اٹھ کر باورچی خانے کی طرف چلی گئیں۔ ان کے جانے کے
بعد نجمہ بولی۔

آماں جانے تمہیں کسی وقت کیا ہو جاتا ہے۔ رہنے دونا۔ اچھا
ہے چند دن آرام سے گزریں گے۔

منصور اگر رہ گئے تو یہ اچھا نہ ہوگا۔ میں تو یہی سوچ رہی تھی۔ تو
ابھی بچہ ہے۔ نہیں سمجھ سکتی۔ وہ لڑکی دیکھتی نہیں۔ منصور کے سامنے
کیسی بھولی بنی رہتی ہے۔ اسی لئے میں کہہ رہی ہوں اس کو ہمیشہ نظر
کے سامنے رکھنا ہی ٹھیک ہے۔ رشیدہ نے کہا۔
مگر خالہ جان ناراض ہو گئی ہیں۔

یہ ہی تو تشویش کی بات ہے۔ کہیں منصور بھی تو نہیں رہ رہے۔
نہیں آماں۔ وہ تو جا رہے ہیں۔ ابھی ناہیدان کے کپڑے وغیرہ
بکس میں رکھ رہی تھی۔ تجھ شرا تے ہوئے بولی۔

اچھا تو پھر رہنے دیتی ہوں۔ آپا کی ناراضگی تو نہیں لینی۔ اللہ کرے
اس لڑکی کو موت آجائے۔ ہر جگہ اس کی محو سنت آڑ ہے۔

(۲۳)

دو دن اور گزر گئے۔ رشیدہ اب جانے کی تیاری میں لگی تھیں۔ آ
رات کی گاڑی سے وہ جا رہی تھیں۔

صبح چائے کے بعد فہمیدہ بیگم نے رشیدہ بیگم سے کہا۔

رشیدہ۔ نمو کو کچھ دن کے لئے چھوڑ جاؤ۔

آپا۔ اس کے چچا کو آپ نہیں جانتیں وہ کس طبیعت کے مالک ہیں
جانے کیا سمجھیں۔ ورنہ میں آپ کا کہا کبھی نہ مالتی۔

اے۔ بی اب رہنے دو۔ وہ تو صدا کے تمہارے غلام ہیں بیٹی
انہیں خود دیکھ لوں گی۔ اب ان کا مت کہو۔ تم اپنی بات کہو۔

”مگر آپا۔ پھر کیسے آئے گی۔ یہ۔ ۹“

میں خود بھیج دوں گی۔ تمہیں اس کا فکر نہ کرنا چاہیے۔ دراصل
میں چاہتی ہوں کہ ناہید کے کپڑے سنے سلوانے میں کچھ مدد دے۔
جانواب مجھ سے آنا کچھ نہیں ہوتا۔

اماں رہنے دیں نا۔ خالہ اتنا کہہ رہی ہیں۔ نجمہ جلدی سے بولی

”تو پھر جا کر کہہ دیجیے خالہ جان سے۔“

ابھی کہتی ہوں۔ رشیدہ غصے میں بولی۔

بجھ اپنے کپڑے سمیٹے چلی گئی۔

اور رشیدہ فہمیدہ بیگم کے پاس چلی گئی۔

اے آپا۔ اتنا سارا کھانا کیوں تیار کر رہی ہو۔

راستے میں کھانا ہے۔ یا نہیں؟ فہمیدہ بیگم بولے۔

نمو جانے کہاں گئی ہے۔ رشیدہ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولی۔

ناہید کے پاس ہوگی۔ اپنی تیاری کر رہی ہے شاید۔

رہنے دے تیاری۔ آپ کا کھانا لاتو نہیں جاتا۔ ویسے اس کے چچا کو لکھ

دیجیے گا۔ ورنہ وہ میرے سر پر سوار ہو جائیں گے۔

اچھا اچھا۔ میں لکھ دوں گی۔ تم فکر کیوں کرتی ہو۔ فہمیدہ ہنس کر بولیں۔

دونوں بہنیں ہنسنے لگیں۔

دور سے ناہیدہ نظر آئی۔ وہ اسی طرف آ رہی تھی۔ خالہ کو دیکھ کر بولی۔

ہم آپ سے نہیں بولتے۔

کیوں۔ رشیدہ ہنس کر بولیں۔

آپ سب کے جانے کے بعد ہمارا جی کیا خاک لگے گا۔ بھائی جان بھی

چلے جائیں گے۔ آپ کو تو ذرا بھی رحم نہیں آتا۔ کیا ہے نمو کو چھوڑ جائیں۔

کچھ عرصے کے لئے اس کا بھی آپ نے جواب نہیں دیا۔

ناہیدہ روٹھے ہوئے انداز میں کہہ رہی تھی۔

اے میں صدقے۔ میری لال۔ بھلا ایسا ہو سکتا ہے کہ خالہ تمہارا

کہنا مانے۔ رشیدہ عیاری سے ہنسنے لگیں۔

بیج کہہ رہی ہیں خالہ جان۔ فہمیدہ خوش ہو گئی۔

ہاں۔

ناہیدہ اٹے پاؤں واپس چلی گئی۔ نمو سچے دل سے تیاری کر رہی تھی۔

ناہیدہ اس کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔

ایک خوشخبری۔ نمو۔

کیا۔؟

پوچھو تو سہی۔

قیوم بھائی آئے ہیں۔

ہائے تو بہ۔

پھر۔؟

تمہارے لئے خوشخبری۔

کیا۔؟

خالہ سنے اجازت دے دی۔

سچ - ۹

قسم اللہ کی۔

نمو کے ہاتھ رک گئے۔ اور وہ ناہید سے لپٹ گئی۔

وہ دونوں خوشی میں یونہی لپٹی ہوئی تھیں کہ منصور آگئے۔ نمو

جھینپ کر الگ ہو گئی۔

اجازت مل گئی ناہید۔

ہاں۔ بھائی جان۔ بڑی مشکل سے دی ہے اجازت۔

وہ تو ظاہر ہے۔ منصور مسکرائے۔

ناہید۔ میری اچھی بہن۔ جا میرے کمرے سے وہ البم تو اٹھا لا۔

میں ساتھ لے جاؤں گا۔

کون سا بھائی جان۔ ناہید نے پوچھا۔

وہی لندن والا۔

اچھا ابھی لاتی ہوں۔ ناہید باہر نکل گئی۔

اس کے جانے کے بعد منصور بولے۔

نمو۔

جی۔ جیسا سے بوجھل پالکیں تھرائیں۔

میں نہ آسکا تو۔ ۹

جی ۹ وہ پریشان سی ہو گئی۔

اگر چھٹی نہ مل سکی تو۔ ۹

”تو پھر میں چلوں۔ ۹“

”نہیں کچھ دن رہو۔ میں ویسے پوری پوری کوشش کروں گا۔

منصور۔ نمو نے پہلی مرتبہ بڑی کوشش سے اسے پکارا۔

کہو۔ منصور کو پہلی مرتبہ اپنے نام میں دکشتی نظر آئی۔

آپ۔ چچی جان سے یہ نہ کہیے گا کہ میں پیڈی جا رہا ہوں۔ بلکہ کہیں اور

کے بہانے۔

مگر کیوں۔

آپ نہیں جانتے۔ پھر وہ ایک دن بھی مجھے نہ رہنے دیں گی۔

اچھا۔ کہیں اور دورے وغیرہ کا بہانہ کر دوں گا۔

کب تک آئیے گا؟ شرم میں ڈوبی ہوئی آواز ابھری نہیں انتظار

رہے گا نا۔

جی نہیں۔ بھلا مجھے کیوں انتظار ہونے لگا۔

منصور زور سے ہنس دیئے۔ بڑی عجیب ہونٹم بھی۔

کیوں۔

ناہید کے قدموں کی آواز سے دونوں سنبھل گئے۔
 یہ لیجیے بھائی جان۔ وہ بیچاری نہ جانے کہاں سے الہم ڈھونڈ
 کرائی تھی۔
 نموبھی الہم دیکھنے لگی۔

منصور کی لندن۔ اٹلی۔ فرانس وغیرہ کی تصویریں تھیں۔ کہیں
 وہ دوستوں کے ساتھ تھا۔ کہیں لیبارٹری میں تجربہ کر رہا تھا۔
 کہیں کسی مریض کے ساتھ تھا۔ کہیں مریضوں کو دیکھ رہا تھا۔ کہیں
 لیکچر دے رہا تھا۔

اور ایک جگہ نیلی آنکھوں والی لڑکی کے ساتھ ہنس رہا تھا۔
 نیلی آنکھوں والی اس لڑکی کی کئی تصویریں تھیں
 نمونے فوراً معنی خیز نظروں سے منصور کو دیکھا۔

یہ میکی ہے۔ بڑی اچھی تھی بے چاری۔

وہ اُسے گھور کر رہ گئی۔

باہر سے سنجہ کی آواز آئی۔ تو منصور جلدی سے باہر چلے گئے
 رات کو سب ہی اسٹیشن پر گئے۔ مسرور احمد کی باون ماڈل کار
 میں فہیدہ بیگم، رشیدہ بیگم اور منشی جی تھے۔ ٹیکسی میں منصور اور کیوں
 کے ساتھ تھے۔

کبھی کبھی تو ڈرا دیتی ہو۔

نموسکرادی۔

سیج سیج بناؤ انتظار کرو گی نا۔

نہیں۔

تو پھر میں نہیں آؤں گا۔

نہ آئیے۔ وہ بے پرواہی سے بولی۔

اچھا۔ یونہی سہی۔ منصور مصنوعی اسی چہرے پر لاتے ہوئے بولے۔

تو پھر۔

اچھا نمو۔ خدا حافظ۔ اب نہیں آؤں گا۔ وہ اٹھتے ہوئے کہنے لگے۔

سنبھلیے۔ نموسج جگھر آگئی۔

کیا ہے۔ وہ مڑ کر دیکھنے لگے۔

میں انتظار کروں گی۔ اس کے لہجے میں بڑا بھولپن تھا۔

کس کا۔ منصور اپنی ہنسی ضبط کرتے ہوئے بولے۔

آ۔ آ۔ آ۔ پ کا۔ وہ پلکیں جلدی جلدی جھپکاتی ہوئی بولی۔

منصور تیزی سے اس کے قریب آگئے۔

کتنی معصوم ہو تم۔ وہ اس کے سر پر چپٹ لگا کر کہنے لگے۔

نمونے شہر اکرم نہ ہاتھوں سے چھپا لیا۔

رشیدہ بیگم اور سنجہ برین میں بیٹھ گئیں۔ باقی لوگ پلیٹ فارم پر باتیں کرتے رہے۔

منصور کا کپڑا ٹنٹ پیچھے تھا۔ وہ بھی اپنا سامان رکھوا کر آگے گاڑنے و سلا دیا اور گاڑی رینگنے لگی

رشیدہ اور سنجہ دوزخ کا تھڑاٹی رہیں۔ جب منصور کا کپڑا ٹنٹ منمو کے سامنے سے گزرا تو انھوں نے تھپتھپ کر جھک کر سلام کر دیا۔

منمو کا دل دھڑک اٹھا۔ گاڑی چلی گئی۔

تب وہ مسرور احمد کی باون ماڈل کار میں گھر آئے۔ راستے میں دو جگہ موڑ رک گئی۔

مائے آبا جان۔ خدا کے لئے اب اسے بدل لیجئے۔ ناہید نے کہا۔ بیٹی اب بھی لاکھوں سے اچھی ہے۔ کل گیراج لے جاؤں گا۔ معمولی سی خرابی ہے۔ اے توبہ۔ جہینہ کے دس دن تو گیراج میں رہتی ہے۔ ہر وقت معمولی سی خرابی ہے۔ جہینہ بیگم جل کر رہیں۔

منمو اور ناہید منہ چھپا کر ہنسنے لگیں۔

اور مسرور احمد منشی کو کہنے لگے۔

منشی جی۔ ذرا دھکا تو لگاؤ۔ سٹارٹ نہیں ہو رہی۔

(۲۴)

چار دن گزر گئے۔ لیکن منصور نہیں آئے۔

منمو کی آنکھیں ہر وقت گیٹ پر لگی رہتیں۔

آج جب چوتھا دن گزر گیا۔ تو اس نے سمجھ لیا کہ وہ اب نہیں آئے گا۔ ضرور اسے چھٹی نہیں ملی۔

اس عرصے میں وہ گھر میں بالکل گھل مل سی گئی تھی۔ زیادہ وقت ناہید کے ساتھ گزرتا۔ جہینہ بیگم کے پاس بیٹھ کر وہ انھیں کتابیں پڑھ کر سناتی۔ مسرور احمد کے لئے حقہ بھر کر لاتی۔ اور حشمت بڑا کے ساتھ جا کر ان کے منع کرنے کے باوجود کھانے میں مدد دیتی۔

ناہید کے لئے اس نے مشین ایئر ایڈری کا سیٹ بنانا شروع کر دیا اس وقت بھی وہ مشین پر بیٹھی چادر پر بھپول بنا رہی تھی۔

تیلی سفید کلیوں والی قمیض اسی رنگ کی سادہ شلوار اور سادہ دوپٹے اوڑھے ہوئے تھی۔

دوپہ کو وہ تہائی تھی۔ مگر ابھی تک کنگھی نہ کی تھی۔ برش کر کے لمبے اور

چکیلے بالوں کو یونہی پشت پر چھوڑ دیا تھا۔

وہ چادر کو رکھ کر نکیہ مشروع کر رہی تھی کہ ناہید آگئی۔

چھوڑو نمو کیا ہر وقت لگی رہتی ہو۔

کیا کروں تمہارا جینز بھی تو ہوتا ہے۔

ہوں۔ جینز۔

ناہید جب خم اس تکے پر سر رکھو۔ تو مجھے ضرور یاد کر لیا کرنا!

ہاں ٹھیک تو ہے۔ یہ نکیہ میں تمہارے لئے بڑے ارمانوں سے تیار رہی

ہوں۔ یہ جنہیں میری یاد دلائے گا۔

اچھا۔ اب ہر بانی فرماؤ۔ چلو آج تمہیں اپنی ایک سہیلی کے ہاں لے چلوں۔

”آج۔“

”ہاں۔“

کل چلیں گے۔ آج مجھے یہ کام پورا کر لینے دو۔

ہوں آج۔ ناہید مصر تھی۔

اچھا۔ مگر اسی لمحے حسرت داخل ہوئی۔

میں نے کہا بیٹا۔ چھوٹے بھتیآئے ہیں۔ وہ بولی۔

کیا ناہید

ہاں۔ چھوٹے بھتیآئے ہیں۔ وہ اپنی زبان میں بولی۔

بھائی جان۔

ہاں۔

اور تمہو کے دل کی کلی کھل اٹھی۔ اسے یوں لگا جیسے حسرت اس سے

کہہ رہی ہو۔

نمو۔ بہا ر آئی ہے۔

پھول کھلے ہیں۔

کلیاں چٹک رہی ہیں۔ پھولوں کی بارش ہو رہی ہے۔ جاؤ اپنی جھولی

بھرو۔

جاؤ پھولوں کو جوڑے میں سجاؤ۔ گجرے پہنو۔ پھولوں کو لادلو۔ جاؤ

اُس نے جب نظر اٹھا کر دیکھا تو ناہید را جاکلی تھی۔

تب سوئی اس کی انگلی میں شہجہ اور خون کا سرخ موتی ٹیکے میں جذب

ہو گیا۔ بال اس کا چہرہ چھپا رہے ہیں۔ اُس نے سر جھٹک کر انھیں دیکھ

کیا۔ تو منصور آہی گئے۔

اب۔ وہ خود ہی شرا گئی۔

اسی لمحے ناہید آگئی۔

بیچ بیچ نمو بھائی جان آگئے ہیں۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ ٹور (TOURE)

پر آئے ہیں۔ گورنمنٹ نے ایک ہم کے لئے بھیجا ہے کہ قصبوں میں جتنے

بھی مرکز ہیں اُن کا سروے کیا جائے۔ تو میری ڈیوٹی بھی اس طرف لگی۔ اسی لئے آیا ہوں۔

اچھا۔ نمونے بے پروائی ظاہر کی۔

میں جاؤں۔ چائے بنا دوں۔ تھکے ہوئے آئے ہیں۔ وہ یہ کہتے ہوئے چلی گئی۔

وہ پھر تکیے پر پھول بتانے لگی۔ دھاگے کے بے جان پھول۔ اسے یوں لگا جیسے ان سے ایک مذہبوش کن خوشبو نکل کر اس کے دل و دماغ پر چھا رہی ہے۔ وہ پھول اُسے مسکرا کر دیکھ رہے ہیں۔ اسی لمحے کمرے میں آہٹ سن کر وہ چونک گئی۔
منصور سامنے کھڑے اُسے دیکھ رہے تھے۔

وہ ہی والہانہ پن۔

وہ ہی میٹھی نظریں۔

وہ ہی بے پناہ پیار۔

وہ ان نظروں کی کبھی بھی تو تاب نہ لاسکی تھی۔ وہ اُٹھ کھڑی ہوئی، نظریں آپ ہی آپ جھجک گئیں۔ کتنے ہی لمحے خاموشی میں بیت گئے۔
آخر منصور بولے۔

نمو۔

لگا ہیں تشکر لئے ہوئے اٹھیں۔

میں آگیا ہوں۔ جذبات جالتے کیوں جھلنوں کا ربط نہیں جان سکتے۔

سیچ۔ اُس نے بھی خوشی میں پھول کر دلیسا ہی جواب دے دیا۔

اور پھر دونوں ہنس پڑے۔ کتنی عجیب بات ہو گئی تھی۔

دونوں فقرے کتنے مضحکہ خیز تھے۔ وہ تو آہی کیا تھا۔ اور اس کے

سامنے ہی تھا۔ اور اس میں جھوٹ بھی کیا تھا۔ مگر پھر بھی محبت نے زبان

کھولی تو کس طرح۔

”تمہیں انتظار تھا“

”میں تو بایوس ہو چکی تھی۔“

مجھے تمہاری سوچ سے خوف آتا ہے نمو۔ تم ایسی باتیں مت سوچا

کر۔ تم زندگی کو بایوسی کا محور کیوں سمجھے ہوئے ہو۔

اب نہیں سوچوں گی ایسا۔ اس نے دبی زبان میں کہا۔

ہاں بالکل۔ خبردار۔ ورنہ

ورنہ کیا ہوگا۔ نمو کے لہجے میں شوخی تھی۔

ورنہ تھپڑ تھپڑ منصور نے ہاتھ دکھائے۔

وہ ہنس دی۔

میں صرف دس دن کے لئے آیا ہوں۔

صرف - نمربولی -

ہاں چھٹی زیادہ نہیں ملی - یہ بھی بڑی شکل سے ملی ہے -
چچی جان تو پوچھتی ہوں گی -

ہاں کہہ رہی تھیں - کہ کہاں جانا ہے ؟
میں نے کہہ دیا - کہ دیکھا توں میں جانا پڑے گا -
بہت جھوٹ بولا - اور بس گناہ تم پر ہے -

مجھ پر کیوں - منحیرت سے کہنے لگی -

ہاں - تم ہی نے تو مجھے پاگل بنا دیا ہے اور تمہارے لئے ہی اللہ
کے اس نیک بندے نے جھوٹ بولا -

ہوں - نہ بولتے - وہ اڑھلا کر بولی -

آج کل یہ کلیاں کیوں چٹک رہی ہیں ؟ منصور نے اُس کی قمیض کے
بھولوں کی طرف اشارہ کیا -

بہار جو آگئی ہے - نمونے برجستہ جواب دیا -

اس لفظ میں جانے کیا تھا - منصور کا چہرہ سُرخ ہو گیا - اور آنکھیں
گہری ہو گئیں - وہ قریب آگئے -

نموسمٹی جا رہی تھی -

منصور نے اپنے دونوں ہاتھ اس کے کندھوں پر رکھ دیے - اور

اپنے ہونٹ اُس کے بالوں پر رکھ دیے -

اسی لمحے ناہید کی آواز آئی -

بھائی جان کہاں ہیں آپ -

وہ دونوں ایک دوسرے سے دور ہو گئے -

ناہید - یہاں لے آؤ - منصور بولے -

ناہید پڑے لئے ہوئے آئی - نمونے پر بیٹھی ہوئی تھی -

ناہید - تم نمونے صاحبہ سے خوب کام لینے لگی ہو - ابھی شکایت کر رہی
تھی کہ جس دن سے آئی ہوں - عین نہیں -

ہائے اللہ کتنا جھوٹ - نمونے پر لیٹا ہو گئی -

منصور منہس پڑے اور ناہید مسکرا کر بولی -

تم تو خواہ مخواہ پریشان ہو گئی ہو - بھائی جان کی عادت ہی
ایسی ہے -

ناہید نے چائے بنا کر منصور کو دی - اور نمونے کو بھی پیالی دی -

چائے پیتے ہوئے وہ میٹھی میٹھی فطروں سے نمونے کی طرف دیکھ

رہے تھے - اور وہ اپنے آپ کو زندگی میں پہلی مرتبہ اتنا اہم سمجھ

رہی تھی -

نجمہ کا کیا حال تھا بھائی جان -

اچھی تھی۔

انھیں آپ نے بتایا تھا کہ آپ یہاں پر آرہے ہیں۔ مجھے خود معلوم نہیں تھا۔ میں وہاں سے آگیا تو بعد میں پتہ چلا کہ میری ڈیوٹی اس طرہ ہے۔ وہ نموکا منہ چڑاتے ہوئے بولے۔

چائے کے برتن خالی ہو گئے تھے۔ ناہید پیالیاں ٹرے میں رکھ کر واپس چلی گئی۔ منصور پھر بولے۔

نمورات کو اوپر والے کمرے میں آؤ گی۔
”نہیں۔“

”کیوں۔“
”تم مجھے بُرا انسان سمجھتی ہو کیا۔
خدا نہ کرے۔“

تو پھر۔

ڈر لگتا ہے۔ وہ دھڑکتے دل کے ساتھ بولی۔

کس سے۔

کوئی دیکھ لے تو۔

کوئی نہیں دیکھے گا۔

نہیں۔

اچھا۔ تمہاری مرضی۔ میں تو چاہتا ہوں۔ ساری رات تم سے
اتیں کرتا رہوں۔

مجھے معاف کر دیجئے۔ ایسا میں نہیں کر سکوں گی۔
کوئی بات نہیں۔ تم مجھ سے بات نہ کرو۔ لیکن میرے سامنے رہو۔
وہ مسکرا دی۔

نمو۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد منصور نے پکا را۔
پھر وہی نظریں اٹھیں۔

آج شام چلو، کہیں گھوم آئیں۔
جی۔

ناہید کو بھی بے چلپیں گے۔
جیسے آپ کہیں،

تم اتنی فرمانبردار کیوں ہو۔ نمو۔

بہت لڑ چکی آپ سے۔ وہ ہنس کر بولی۔

اور اب اس کی تلافی کر رہی ہو کیا۔

نہیں تو۔ یونہی خوش رہنے کو جی چاہتا ہے۔

نمو۔ اس دن جانے مجھے کیا ہو گیا تھا۔

کس دن؟

جس دن میں نے تمہیں مارا تھا۔ سارا دن میں پریشان رہا۔ تم مجھے کونستی ہوگی اور ذلیل سمجھتی ہوگی۔

نہیں نہیں۔ میں تو اس دن زندگی میں پہلی مرتبہ سکون سے سوئی تھی۔
تمو۔ منصور کی آواز جذبات میں ڈوب گئی۔

سچ کہہ رہی ہوں۔

وہ پکیں جلدی جلدی چھپکاتے ہوئے بولی۔

باہر فہمیدہ بیگم کی باتیں کرنے کی آواز آئی۔ منصور اسے پیار سے دیکھتے ہوئے باہر نکل گئے۔

اور وہ پھر تکیے پر چھپول بنانے لگی۔

فہمیدہ بیگم کمرے میں آگئیں۔

چھوڑ دیٹی۔ اب شام ہو رہی ہے۔ اس وقت دیدہ بیری اچھا نہیں

وہ پیار سے بولیں۔

اچھا خالہ جان۔ وہ مسترت سے بھرپور جذبات سے مشین سے اٹھ

بیٹھی۔ شام کو وہ دونوں منصور کے ساتھ گھر میں گئیں۔

(۲۵)

فہمیدہ بیگم صبح کی نماز پڑھ رہی تھیں۔

نمو بھی آگئی۔ اس نے وضو کر کے نماز پڑھی۔

بیٹی۔ ناہید اٹھی ہے۔ فہمیدہ بیگم۔ سلام پھیر کر بولیں۔

جی نہیں ابھی اٹھاتی ہوں۔

جاؤ۔ اسے کہہ نماز کا وقت نکلا جا رہا ہے۔ فہمیدہ بیگم تسبیح

تکالتے ہوئے کہنے لگیں۔

اچھا۔ خالہ جان۔ ابھی اٹھاتی ہوں۔ دراصل اسے نیند بہت

پالیدی ہے۔

ہاں۔ دونوں بہن بھائی نیند کے پیارے ہیں۔ ناہید تو پھر بھی

اٹھ جاتی ہے۔ منصور تو دیر تک سوتے ہیں۔ نماز بھی کبھی کبھار پڑھتے ہیں

وہ محبت میں لولیں۔

نمو ہنستی ہوئی باہر نکل گئی۔

صبح بڑی نشیمن تھی۔ کونے میں لگے ہوئے درخت پر چڑیاں چیچیا کر
فضا کو رنگین بنا رہی تھیں۔ حشرت بواچو لھا جلا رہی تھیں۔ منشی جی
بھی آگئے تھے۔ ٹھنڈی اور معطر ہوا چل رہی تھی۔ نمو گنگنائی ہوئی
ناہید کے کمرے میں چلی گئی۔ وہ ابھی تک سوئی ہوئی تھی۔

ناہید اٹھو نماز کا وقت زکلا جا رہا ہے۔ وہ محبت سے اس کے سر
پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہنے لگی۔

آں اٹھتی ہوں۔ وہ کروٹ بدل کر پھر سو گئی۔

سورج نکل آئے گا۔

اچھا نا۔ اٹھتی ہوں۔

شکر ہے قیوم بھائی کا اپنی دوکان کا کام ہے۔ جس وقت دل چاہا
چلے گئے۔ اگر کہیں دفتر جانا ہوتا تو بے چارے بغیر ناشتہ کئے ہی جاتے
نمونے ہنس کر کہا۔

ہوں۔ بڑی آئی سہروردین کر۔ ناہید آنکھیں ملاتے ہوئے اٹھ بیٹھی۔

اچھا اب بیٹھو۔ نماز پڑھ لو۔

چل تو رہی ہوں۔ وہ دوپٹہ اوڑھ کر کھڑی ہو گئی۔

اس کے جانے کے بعد نمو کے دل میں ایک انجانا سا خیال آیا۔ وہ شرمایہ
گئی۔ مگر پھر ہمت کر کے آگے بڑھی۔ اس کا چہرہ گلگوں ہوا تھا۔ اور شرمائی
لجائی ہوئی منصور کے کمرے کے قریب آگئی۔

گھر میں تو کسی کے آنے کا ڈر ہی نہیں تھا۔ بیگم ناشتہ تیار ہونے
تک طیفہ کرتیں۔ مسرور احمد اپنے کمرے میں اخبار پڑھتے رہتے تھے۔

نور کا ناشتہ تیار کرنے میں مصروف ہوتے۔ البتہ ناہید تھی جو۔ گرد بھی
وضو کر کے نماز پڑھ گئی۔ پھر ناشتے کا انتظام دیکھ گئی۔

جب تک کافی وقت تھا۔

وہ آہستہ سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی۔

منصور تکیہ موڑے ہوئے بے سدھ پڑے تھے۔ بال بکھر کر پیشانی پر
آگئے تھے۔ وہ کچھ دیر کھیتی رہی اور پھر آگے بڑھی۔

منصور کی بڑی بڑی گہری آنکھیں بند تھیں۔ جن کی گہرائی میں اسے
اپنا آپ ڈوبنا محسوس ہوا۔

وہ پلنگ کے کونے پر بیٹھ گئی۔ دل بڑی طرح دھڑک رہا تھا۔ منصور

سوتے ہوئے بڑے اچھے لگ رہے تھے۔ اس نے اپنی کانپتی ہوئی لمبی لمبی
انگلیاں اٹھائیں۔ اور ان گہری آنکھوں پر رکھ دیں۔ منصور روتے بنا کر رہ گئے۔
اور پھر وہی انگلیاں جراثیمات کر کے منصور کے بالوں میں گنگھنی کرنے لگیں۔

منتہر جاگ گئے تھے۔ اُنھوں نے آنکھیں کھول دیں۔ نموکو اپنے اوپر
جھکا دیکھ کر اُنھوں نے پھر آنکھیں بند کر لیں۔
نمواٹھ کر جانے لگی تو اُنھوں نے فوراً اس کا ہاتھ پکڑ کر
اسے کھینچ لیا۔ وہ بری طرح شرانگی۔

کیوں جی۔ منصور اسی طرح اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھے۔
ادنی اللہ چھوڑیے نا کوئی آجائے گا۔ وہ کسمائی۔ ہوں۔ نہیں۔
نہیں چھوڑیں گے۔
چھوڑیے نا۔

کیوں مجھے نیند سے اٹھایا ہے۔ اُنھوں نے اسے کھینچ کر پلنگ پر
بٹھالیا۔
بڑا لگا کیا۔

کاش۔ ہر وقت اٹھایا کرو۔ منصور ٹھنڈا سا سن لے کر بولے۔
تو اٹھکھ دیا کروں گی۔ یہ تو نیکی کا کام ہے۔ اٹھ کر نماز پڑھیے۔
اور اگر وعدے پر پوری نہ آئیں۔ منصور بولے۔
کل سے ایسا ہی کروں گی۔

اور اگر ایک دن تم نہ آئیں تو ہم نہیں اٹھیں گے۔
تب وہ دونوں کھکھلا کر منہں پڑے۔

اچھا۔ اب اُٹھیے۔

کیا جلدی ہے۔

ہائے اللہ کیسے ہیں آپ۔ میں چلی۔ وہ اُٹھ کر دروازے کی طرف بھاگ گئی۔
منصور اس کی طرف جلدی سے لپکے۔ مگر وہ ہنستی ہوئی باہر نکل گئی۔

نہیں آبا جان۔ کوئی خاص کام تو ہے نہیں۔ بوہنی تفریح رہتی ہے۔
دوسرے ڈاکٹر چلے جاتے ہیں۔ منصور نے بڑی صفائی سے جھوٹ بول دیا۔
اس وقت نمواس کی طرف دیکھ کر مسکرا دی۔

آبا جان کہیں ایسا نہ ہو کہ موٹر سے کسی خاص مقام پر جا کر دھوکا دیدے
منصور بولے۔

نہیں احتیاط کرنا۔ پُرزے تو سارے دلاؤتی ہیں۔ دراصل یہاں
کے کاریگر اُسے ٹھیک نہیں کر سکتے۔ یہ تو وہاں کی چیز ہے۔ وہی لوگ جانتیں۔
بس اسی وجہ سے ٹھیک نہیں ہوتی۔ مسرور احمد نے جواب دیا۔
اے رہنے دو! ایسی موٹر سے تو بوہنی اچھے ہوئی مہینے کے دس بیس دن
تھوگیراج میں پڑی رہتی ہے۔ فہمیدہ بیگم جل کر بولیں۔

سب مہننے لگے۔

ناشتے کے بعد منصور نے ناہیدرا درنمو کو کہہ دیا کہ جلدی سے تیار ہو جا
تمہیں سیر کروالاؤں۔

دو دونوں تیار ہونے چلی گئیں۔

نمو۔ ساڑھی پہنوں گی۔ ناہیدرا نے بالوں میں کنگھی کرتے ہوئے پوچھا۔
نہیں میرے پاس ایک ہی تو ساڑھی ہے۔

چلو۔ وہی پہن لو۔

(۲۶)

ناشتے پر منصور بے حد خوش تھے۔ ناہید کو بار بار پریشان کر رہے تھے۔
بڑے ہو گئے۔ گز بچینا ابھی تک نہیں گیا۔ فہمیدہ بیگم نے کہا۔
یہ بھی تو بڑی ہو گئی ہے۔ اُتی۔ اسے آپ کچھ نہیں کہتیں۔
بیٹا۔ بہن کو مت تنگ کرو۔ لڑکیاں تو جہان ہوا کرتی ہیں۔ مسرور احمد
کے اس فقرے نے سب کو ہی اُداس کر دیا۔ آخر منصور کے دل پر بھی بہت ہوا۔
مگر اُداسی کو دور کرنے کے لئے فوراً بولے۔

آبا جان۔ آج ہم آپ کی گاڑی لے جائیں گے۔

لے جانا۔ گز بیکھنا ذرا گھبرائیں جاتا ہے۔ مسرور احمد نے کہا۔
فہمیدہ بیگم مسکراتے لگیں۔

ناہیدرا تو کبھی ایک دوسرے کو دیکھ کر ہنس دیں۔
چلو لڑکیو تیار ہو جانا۔ آج آبا جان کی گاڑی مل رہی ہے۔ تمہیں بھی سیر
کرا لاؤں گا۔ آج میں دورے پر نہیں جاؤں گا۔

نہیں بیٹا۔ دورے پر چلے جاؤ۔ مسرور احمد بولے۔

پھر تم بھی بہنو۔
اچھا۔

دونوں نے ساڑھیاں باندھیں۔ منو کی سفید ساڑھی تھی جس کا بارڈر
کلے رنگ کا تھا۔ اور کا لاہی بناؤڑ تھا۔ ناہید کی ساڑھی آسانی تھی۔
اور اسی رنگ کا بلاؤڑ دونوں نے ایک دوسری کے ڈھیلے
ڈھیلے جوڑے باندھے۔

منصور بھی آگئے۔ وہ سفید پتلون اور سفید قمیض میں تھے۔

تم لوگ تو گویا شادی پر جا رہی ہو۔ انھوں نے دونوں کو گھور کر دیکھا۔
نمو اور ناہید دونوں ہی شرمگین۔

فہیدہ بیگم نے حشمت کے ہاتھ ٹوکری میں پھل مٹھائیاں اور نقرہ موس میں
چائے بھی بھج دی۔

نمو اور ناہید پیچھے بیٹھ گئیں۔ منصور آگے بیٹھ گئے۔ اور کارٹا
کردی۔ جانے آج کار بھی اچھے موڈ میں تھی کہ فوراً ہی سٹارٹ ہو گئی۔

مختلف سڑکوں سے نکل کر ایک سرسبز راستے پر چلتے ہوئے وہ سب
خوشگوار ہوا کو محسوس کر رہے تھے۔

موٹر کا ایک گیئر پھر بھنس گیا۔

الذخیر۔ منصور نے پھر نعرہ لگایا۔

کیا ہوا۔ دونوں نے ایک ساتھ پوچھا۔

گیئر بھنس گیا۔

اب کیا ہوگا۔

نکل گیا۔ منصور نے کوشش کے بعد کہا۔

اور پھر کئی جگہ پر رکتے ہوئے وہ ایک حسین دادی میں پہنچ گئے۔ انوار پر نے
کیا درجہ سے کافی لوگ پکنک پر آئے ہوئے تھے۔

کہیں پر گر اموفون بج رہا تھا۔ کہیں کچھ پک رہا تھا۔ کہیں لڑکیاں پانی

میں پاؤں ڈبوئے ایک دوسرے پر پانی پھینک رہی تھیں۔

منصور نمو اور ناہید کو لے کر درختوں کے سائے میں بیٹھ گئے۔

لوگ پکنک منارہے تھے۔

اچانک ایک طرف سے قیوم آگلا۔

ہیلو۔ منصور۔ وہ دُور سے بولا۔

ہیلو۔ آؤ۔ بھیا۔ گریہاں تم سے پردہ کرنے والے موجود ہیں۔

منصور نے ہنس کر ناہید کی طرف دیکھا۔ جو منو کے پیچھے دبک گئی تھی۔

کیا ہوا۔ وہ میرے ماموں کی بیٹی بھی تو ہیں۔ اسی رشتے سے میں آکر

بیٹھ جاؤں گا۔ قیوم دُور سے ہنستے ہوئے بولا۔

بھئی اجازت تو لے لوں۔ منصور ہنس کر بولے۔

مبلا لوں قیتوم کو۔

اُس نے ہنس کر ناہید سے پوچھا۔

کبوں ناہید۔

نہیں بھائی جان۔ خدا کے لئے مت مبلائیے گا۔ ناہید کی آواز شرم میں ذہبی ہوئی تھی۔

کیا ہوا۔ آجائے بے چارہ۔ آخر وہ ہماری پھوپھی کا بیٹا بھی تو ہے۔

نہیں بھائی جان۔ اگر آتی کو پتہ چل گیا تو وہ کیا کہیں گی۔ ناہید ڈی ہوئی آوازیں بولی۔

میں آجاؤں۔ قیتوم نے پھر آواز دی۔

تو بہ کیسے ڈھبٹ ہیں۔ ناہید نے آہستہ سے منو سے کہا۔

بھئی کیا کروں۔ اجازت نہیں مل رہی۔ منصور نے زور سے کہا۔

بھئی میری طرف سے منو بہن کی منت کر دو۔ قیتوم نے پھر کہا۔

لو بھئی منو سن لو۔ کیا ہوا اگر وہ آجائے۔ اماں کو پتہ نہیں چلے گا۔

کہے گا۔ ادرا ب تو اس بیچارے کا نکاح بھی ہو چکا ہے۔ قیتوم پر منصور کا ترس آ رہا تھا۔

مبلا لیجیے۔ منو نے کہا۔ ناہید اُس کی چٹکی لے کر بولی۔

ہائے اللہ۔ میں کیا کروں گی۔ ناہید پیٹھ موڑ کر بیٹھ گئی۔

منصور نے زور سے کہا۔

آجاؤ قیتوم۔

مشکریہ۔ وہ مسکراتا ہوا بولا۔

آکر منصور کے قریب بیٹھ گیا۔

السلام علیکم۔ اُس نے منو کی طرف دیکھ کر کہا۔

آداب۔ منو آہستہ سے بولی۔

ہمارے ماموں کی بیٹی کو بھی ہمارا سلام کہہ دیں۔ قیتوم ہنس کر بولا۔

بھئی اب تم آرام سے بیٹھو۔ ورنہ نکال دیے جاؤ گے۔ منصور نے کہا۔

ناہید پیٹھ موڑے سرخ ہو رہی تھی۔ منو بار بار اسے چٹکیاں بھر رہی تھی۔

منو بہن۔ آپ سے اماں بہت خفا ہیں۔ آپ ہمارے ہاں کیوں نہیں آتیں۔ قیتوم نے کہا۔

جی۔ آؤں گی خالہ جان کے ساتھ۔ منو ہلکے سے بولی۔

ویسے امیر اللہ بڑی فرمانبردار معلوم ہوتی ہیں۔ قیتوم منصور کی طرف دیکھ کر بولے۔

اس فقرے پر ناہید کو بھی ہنسی آگئی۔

قیتوم نے سن لیا اور بولے۔

اے بی وہی ہوا اب بھی۔ جو سارا وقت ہم سے ٹافیاں کھایا کرتی تھی
اب خیر سے پردہ ہو رہا ہے۔

منصور اور نمونہس کر رہ گئے اور ناہید جھینپ گئی۔

ویسے منصور بھائی تھماری بہن بڑی چور قسم کی لڑکی ہے کتابیں پڑھا
لے آئی تھی گھر سے۔

کوئی نہیں ہیں تو پھر بھی جان لے دی تھیں۔ ناہید جلدی سے غصے میں
کہہ گئی۔ مگر پھر وہ خود ہی جھینپ گئی۔

قیوم تہقہ لگا کر ہنس دیئے۔ کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے۔ ویسے منصور
بھائی آپ کی بہن کی آواز کچھ سریلی ہو گئی ہے۔

قیوم مسخرے اب ہر باتی فرماؤ۔ منصور ہنس کر بولے۔

نمونے پھل اور مٹھائی پلیٹ میں ڈال کر رکھ دی۔ اور تھرموس سے چائے
پیالوں میں انڈیلنے لگی۔

چائے ان چاروں نے مل کر پی۔ چائے کے بعد قیوم نے کہا۔

آؤ گھوم آئیں سیالونہی بیٹھے کا ارادہ ہے۔ ویسے نمونہن پیٹھ موڑے
آپ کی بہن بیٹھی ہیں اور گردن میری ٹھکی جا رہی ہے۔

نموزور سے ہنس پڑی۔

شرم تو لگ رہی بھی نہیں پاس سے۔ ناہید آہستہ سے بولی۔

یہ کیا سرگوشیاں ہو رہی ہیں۔

قیوم نے کہا۔

قیوم اور منصور آگے آگے چلنے لگے۔ اور نمونے سچھے ناہید بھی چلنے
لگی۔ پانی کے کنارے گھومتے ہوئے وہ بانیں بھی کر رہے تھے۔

ثم کیسے آئے آج۔

منصور نے قیوم سے پوچھا۔

دوستوں کے ساتھ آیا ہوں۔ گراب تو راموں جان کی خوبصورت کار
میں جاؤں گا۔

ہائے اللہ۔ اب یہ سچھا تھوڑی چھوڑیں گے۔ ناہید نے کہا۔

ویسے آدمی دلچسپ ہیں۔

نمونے ہنس کر کہا۔

کچھ دیر سب گھومتے رہے۔ قیوم بار بار مڑ کر دیکھتے مگر ناہید اپنے آپ کو
بڑی طرح چھپا رہی تھی۔

کافی دیر بعد سب موٹر میں جا بیٹھے۔ اور منصور نے موٹر اسٹارٹ کر دی۔

گھنٹہ سٹارٹ ہونے میں لگا۔ راستے میں موٹر کئی جگہ رکی۔ قیوم بے چارے کو

دھکے لگا لے پڑے۔ ناہید اور نمونہ ہنستے ہنستے پوٹ ہو گئیں۔ اس سے تو

اسکو بڑی اچھا تھا۔ خواہ مخواہ لایچ کیا۔ قیوم جھلا کر بولے۔ اور پھر موٹر اسٹارٹ ہو گئی۔

یہی کہ ہمارا بہنوئی کون خوش نصیب ہوگا۔

خوش نصیب۔ نمو کے لہجے میں اُدا سی جھلک آئی۔

ہاں اور کیا۔ خوش نصیب ہی تو ہوگا۔ اتنی خوبصورت پیاری پڑھی

(۲۷)

لکھی اور اچھی بیوی پا کر۔

کہیں وہ بھی مجھے منحوس نہ سمجھ بیٹھے۔

میں ماروں گی تمہیں۔ ناہید اس کے لہجے سے بے حد متاثر ہوئی۔

اور پھر اس کے چہرے کو دیکھ کر بولی۔

نمو۔ تم نے کیوں اپنے آپ کو کچھ غلط خیال اپنے آپ سے وابستہ کر لئے ہیں۔ اگر تم نے آئندہ ایسی مایوسیاں اپنے آپ سے وابستہ کیں تو یاد رکھنا میں تم سے بات نہیں کروں گی۔

”چلو اٹھو۔!“

نمو اٹھ کر باہر آئی۔

دوڑوں نے وضو کر کے ایک ہی مصیبت پر نماز پڑھی۔ نماز کے بعد ناہید

باورچی خانے ناشتے کے لئے حشمت بُواکا ہاتھ بٹانے لگی۔

اور نمو چپکے سے اپنا وعدہ پورا کرنے چلی گئی۔

کمرہ کھلا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھی۔

منصوبے سُدھ سوتے ہوئے تھے۔ وہ سہراٹے کی طرف جا کر کھڑی

ناہید صبح ہی اٹھ بیٹھی تھی۔

نمو ابھی سو رہی تھی۔

اے بی۔ اٹھو۔ دیکھو دن چڑھ آیا ہے۔

ہوں۔ آں۔ اٹھتی ہوں۔ نمو آنکھیں کلتے ہوئے کہنے لگیں۔

ارے بی۔ اب تو تمہارے اُن کو رو دنا پڑے گا۔ اتنی دیر تو تمہیں اُٹ

میں لگ جائے گی۔ ناہید ہنس کر کہنے لگی۔

نہیں جی۔ معاف رکھیے۔ ایسا نہیں ہوگا۔ نمود پتہ اور دھ کر اپنے بال

انگلیوں سے درست کرنے لگی۔

جی ہاں۔ اری نمو۔ سچ بتا۔ کیا تم نے بھی کسی کو پسند کیا ہے؟

ناہید اس کے قریب بیٹھ کر راز دارانہ لہجے میں پوچھنے لگی۔

ہٹو۔ نمو شرمائی۔

ارے۔ اس میں شرمانے کی کیا بات ہے۔ بتاؤ نا۔

کیا بتاؤں۔

ہو گئی۔ اور آہستہ آہستہ ہلانے لگی۔

منصور منصور اُٹھیں نا۔

منصور سُن کر بھی سوتے بنے رہے۔

اُٹھیں نا۔ مائے اللہ۔

اُس نے جھٹلا کر اُسے جھنجھوڑ دیا۔

منصور مسکرائے۔ لیکن آنکھیں بند ہی رکھیں۔

میں جا رہی ہوں۔

نمونے کہا۔

اوں۔ ہوں۔ منصور نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر اُسے پلنگ پر بٹھالیا۔

ایسے بھی اٹھایا کرتے ہیں کہیں۔ وہ مسکرا کر پوچھنے لگے۔

آپ تو جان کر سوئے رہتے ہیں۔ وہ شرما تے ہوئے بولی۔

تمہارے جگانے کا جو لطف آتا ہے۔

ہوں۔ چلے نا اب۔ کوئی آجائے گا۔

ایک تو تمہارے ڈرنے مجھے بھی بزدل بنا دیا ہے۔

اُٹھیں نا اب۔

نمو۔ ایک بات سنو۔

”کیا۔“

اچھا۔ پھر کہوں گا۔

”اب کہیے نا۔“

بات لمبی ہے۔ تم جلدی مچا کر بات کو خراب کر دو گی۔

اچھا۔ آپ کی مرضی۔ ویسے خیریت کی ہے۔

ہاں خوشی کی۔

میں چلی۔ آپ اب دہر بانی فرما لے پیر مت سو جائیے گا۔

بھئی تم بڑی سخت ہو۔ جب ہمارا تمہارا بیاہ ہو جائے گا پھر بھی ہمیں

سوئے نہیں دو گی۔ منصور اس کی طرف گھور کر بولے۔

بیٹھے۔ اس کی شرم سے آنکھیں جھجک گئیں۔

بتاؤ نا۔؟ منصور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے بولے۔

چپ ہو جائیے نا۔ کیسی باتیں پوچھتے ہیں آپ اس کا چہرہ گلابی ہو رہا تھا۔

بتاؤ نا ورنہ میں جانے نہیں دوں گا۔

ایسا کب ہوگا۔ وہ بڑی حسرت سے کہنے لگی۔

کیوں نہیں ہوگا۔ ضرور ہوگا۔ مجھے تو یقین ہے۔ کیا تم نے ابھی تک یہ

سوچا نہیں۔ منصور فوراً اٹھ کر بیٹھ گئے۔

ایسا کینز کر ہو سکتا ہے؟

میں تو اپنے آپ کو فریب دے رہی ہوں۔ اس کا لہجہ بے حد ادا اس تھا۔

کر رہی ہے منصور اس کی اداسی دُور کرنے کے لئے بولے۔
وہ شرانگئی۔

میں چلی۔ آپ بڑے وہ ہیں۔ وہ اس کے لبوں سے سگریٹ چھین کر نیچے
پھینک گئی۔

منصور ہنس کر سگریٹ اٹھانے لگے۔ اور وہ کمرے سے باہر نکل گئی۔
ناشتے کے بعد فہمیدہ بیگم نے منو سے کہا کہ رضیہ بیگم کے کل دو پیغام آئے
تھے۔ منو آج میرے ساتھ ذرا قیوم میاں کے چلنا۔
اچھا خالہ جان۔ منو ناہید کی طرف دیکھ کر بولی۔
اتنی۔ ہم بھی چلیں۔ منصور بولے۔

ہاں چلے چلو۔ مگر بیٹا جس کام کے لئے آئے ہو۔ وہاں تو ایک مرتبہ بھی
نہیں گئے۔

وہ آماں دراصل میں نے کہہ دیا ہے کہ میرا گھر ہے یہاں۔ اس لئے
مجھ سے کام نہ ہو سکے گا۔ اور پھر آماں کام بھی تو نہیں ہے۔ یونہی چکر لگا پڑتا
ہے۔ میرا دوست میری جگہ کام کر دیتا ہے۔ منصور جھجکتے ہوئے (تسا سارا
جھوٹ بول گئے۔

مگر بیٹا پھر بھی ایک مرتبہ چلے جایا کرو۔ فہمیدہ بیگم نے کہا۔

مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے بیٹا چند دن ماں کے پاس گزارنے کے لئے بہانہ

بڑی پاگل ہو میری منو۔ ایسا نہ سوچا کرو۔ منصور صرف تنہا رہا ہے۔

منصور کی آواز جذبات میں ڈوب گئی۔

مگر میں حالات اور اپنے نصیب کو سمجھتی ہوں۔

کیا حالات ہیں۔

بجائے آپ کی خالہ کی بیٹی ہے۔ میرے لئے دو خاندانوں میں پھوٹ
ڈالنا کون پسند کرے گا۔ اور پھر وہ کہاں برداشت کرے گا۔ میں ان کے
بس میں ہوں۔ چچا میرا وارث ہے۔ اور پھر میرے ایسے نصیب کہاں۔
وہ رکتے رکتے کہہ رہی تھی۔

مجھے خاندان کی پرواہ نہیں۔ منصور بولے۔

وہ دونوں ہنسیں ہیں۔ ایک بد قسمت لڑکی کے لئے کیونکر جدا ہوں گی۔

میری اتنی میری مرضی پر چلیں گی۔ منصور نے درمیان میں کہا۔ مگر

چچا کیوں کر مانیں گے۔ وہ پلکیں اٹھا کر بولی۔

چچا فطری طور پر بڑے اچھے ہیں وہ مان جائیں گے۔

منو نے بڑی محبت اور حسرت سے منصور کی طرف دیکھا اور آہستہ

سے کہا۔

اگر کرے آپ کا کہا آئین ہو جائے۔

ہائے خدایا۔ کیسا زمانہ آگیا ہے، اپنی شادی کی باتیں، پٹاخ پٹاخ

تلاش کر آیا ہے۔ مسرور احمد ہنس کر بولے۔

کمال ہے آبا جان۔ آپ آج چلے میرے ساتھ منصور کے جہیز ہونے پر بخیر کو بے اختیار ہنسی آرہی تھی۔

اچھا اچھا آپ تو بچے کو شرمندہ کر رہے ہیں۔ کام ہی ہو گا۔ آج کل کام بھی تو ایسے ہی ہوتے ہیں۔ فہمیدہ بیگم نے خاوند کی ہنسی برداشت نہ کی۔

منصور کی جان میں جان آئی۔ اُنھوں نے چپکے سے منو کا منہ چڑا دیا۔ بیٹی۔ پھر فٹوڑی دیر میں تیار ہو جانا۔ رضیہ نے آج دوپہر کے کھانے پر بلایا۔

”اچھا خالہ جان۔ میں ابھی تیار ہو جاؤں گی۔

سب اٹھ کر اپنے اپنے کام میں لگ گئے۔

تمو اپنے کمرے میں پہنچ کر ناہید کے گرد ہو گئی۔

”کچھ پیام دینا ہے کیا۔“

لے واہ میں کیوں دینے لگی پیغام کسی کو۔

”اب مجھ سے کیوں چھپاتی ہے۔ کہہ دو نا۔ میں کہہ دوں گی۔“

تمو۔ تم مار کھانے والی ہو گئی ہو۔ اور کچھ نہیں۔ ناہید غصے سے ہنس پڑی۔

وایسے قیوم بھائی میں بڑے شہر۔ اس دن کس طرح پٹار پٹار باتیں بنا ہے تھ۔

اور کیا نورے مسخرے ہیں۔ ناہید شہر اکہنے لگی۔

اچھا بھئی۔ اب میں تیار ہو جاؤں۔ ورنہ خالہ جان بگڑیں گی۔ تمو ہنستے

ہوئے بولی۔

اُس نے ہلکے چاکلیٹی رنگ کا سادہ سوٹ پہنا۔ اسی رنگ کا چٹا ہوا دوپٹہ بال بنا کر فہمیدہ بیگم کے پاس چلی گئی۔ وہ تیار ہو چکی تھیں۔

منصور ٹکیسی لے آئے۔ کیونکہ فہمیدہ بیگم نے کہہ دیا تھا کہ وہ مسرور احمد کی گاڑی میں نہیں جائے گی۔ جو کہ راستے میں خراب ہو گئی تو سارا وقت ٹھیک کرنے میں صرف ہو جائے گا۔

فینوں ٹکیسی میں بیٹھ کر رضیہ بیگم کے گھر روانہ ہو گئے۔

رضیہ اور قیوم بڑی اچھی طرح ملے۔ سارا دن قیوم کی دلچسپ باتیں منصور

کی میڈھی میڈھی نظریں، رضیہ اور فہمیدہ کا خلوص اور شفقت، تمو سب کچھ بھٹلا

چکی تھی۔ اور خوشی کا یہ دن جلد ہی گزر گیا۔

وہ شام تک وہیں رہے۔

نمو ہنس کر بولی۔

مذاق کر رہے ہوں گے۔ آپ ناشتہ کھیجے خالہ جان۔

نہیں بی۔ میں جا کر دیکھتی ہوں۔ فہمیدہ بیگم اٹھ کر چلی گئیں۔ تو سرور احمد ہنسنے لگے۔ ابھی تانا بچوں جیسی حرکتیں کرتا ہے۔ ڈاکٹر بن گیا ہے۔ اور پھر ولایت رہ کر آیا ہے۔

آبا جان وہاں جا کر ذہنیت تھوڑی بدل جاتی ہے۔

وہاں سے تو بیٹی لوگ بدل کر آتے ہیں۔

اللہ نہ کرے ہمارے بھائی کبھی بدلیں۔

اسی لمحے فہمیدہ بیگم ہنستی ہوئی آئیں اور بولیں۔

نہ جانے کیا ہوا ہے۔ ہے نا عجیب لڑکا۔

اور کچھ نہیں ذرا ماں کو لاڈ دکھا رہا ہے۔ سرور احمد بولے۔

اے داؤ لاڈ کسے دکھائے گا۔ فہمیدہ بیگم پھر چڑھی گئیں۔

چلو نمو۔ میں اور تم کو شش کر دیکھیں۔ ناہیدہ بولی۔

دونوں جب منصور کے کمرے میں داخل ہوئیں تو وہ لیٹے ہوئے تھے۔

آج کیا ہوا بھائی جان۔ ناہیدہ ہنس کر بھائی کے پلنگ پر بیٹھ گئی۔ نمو

پائنتی کی طرف کھڑی رہی۔

امتحان ہو رہا ہے نمو زور سے کرا کر بولے۔

(۲۸)

سب ہی ناشتے پر بیٹھ چکے تھے۔ مگر منصور نہیں تھے۔

فہمیدہ بیگم خالی کرسی دیکھ کر بولیں۔

ناہیدہ تنہا رہے بھائی نہیں اٹھے اب ناک۔

آئی۔ میں تو جگانے گئی تھی۔ گردہ اچھے بھلے جاگ رہے ہیں۔ یونہی پڑے ہیں۔ ناہیدہ نے کہا۔

تب نمو کو خیال آیا کہ آج وہ انھیں جگانے نہیں گئی۔ وہ مسکرائی۔ جاؤ حشمت تم ہی جگا آؤ جا کر۔ فہمیدہ بیگم نے کہا۔

اچھا بیگم۔ حشمت چلی گئی۔ اور کچھ ہی دیر بعد آکر بولی۔

بیگم، میاں ضد کر کے پڑے ہیں۔ کہتے ہیں۔ نہیں اٹھیں گے۔

اے اللہ خیر کرے۔ طبیعت تو ٹھیک ہے نا ان کی۔

فہمیدہ بیگم گھبرا گئیں۔

ہاں بیگم ماشاء اللہ ہنس رہے ہیں۔

اللہ خیر۔ فہمیدہ بیگم اور زیادہ گھبرا گئیں۔

تو بس ختم کیجئے اب۔

نہیں بی امتحان لینے والے بڑے سخت ہیں۔ اور میں بھی بتانا چاہتا ہوں کہ میں بات کا بڑا پکا ہوں۔ کسی امتحان سے نہیں ڈرتا۔

میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا بھائی جان۔ ناہید جھلاسی گئی۔
تمو مسکرا دی۔

اب اٹھیے نا۔ ناہید نے کہا۔

تمو نے آنکھوں سے التجا کی۔ اور اٹھے کا اشارہ کیا۔
منصور اور لمبے لیٹ گئے۔

تمو نے ہاتھ جوڑ دیے تو وہ بولے۔

اچھا تو اب اٹھتا ہوں۔ چلو میری اچھی بہن۔

ناشتے پر خوب ہنسی مذاق ہوتا رہا۔

ناشتے کے بعد منصور باہر چلے گئے۔ مسرور احمد بھی باہر چلے گئے۔

تمو نے ناہید کے جہیز کی کڑھائی شروع کر دی۔

تمو سوچ رہی تھی۔ کتنی جلدی یہ دس دن بیت گئے ہیں۔ پھر وہی

دیرانیاں۔ وہی اداسیاں۔ کل منصور واپس جا رہے تھے۔

کیا سوچ رہی نمو۔ ناہید نے اُسے کھوئی کھوئی سی دیکھ کر پوچھا۔

آں۔ کچھ بھی تو نہیں۔

کچھ تو سوچ رہی تھی۔

یہی سوچ رہی تھی۔ کہ اب نجمہ کا جہیز بھی تیار کرنا ہے مجھے۔ اور یہ
بوج رہی تھی۔ تمہارے اس پلنگ پوش پر جو پھول ڈال رہی ہوں نا۔

وہ اس پر نہیں ڈالوں گی۔

ناہید کو اس لمحے نمو جانے کیوں پاگل سی لگی۔ وہ حیرت سے اُسے
دیکھنے لگی۔

پھر اُسے خیال ہوا شاید۔ نمو کو خیال آیا ہو۔ کہ وہ۔ اور آگے وہ
کچھ نہ سوچ سکی۔

تو فکر کیوں کرتی ہے۔ تیرا جہیز میں تیار کروں گی۔ ناہید ہنس کر بولی۔

میر جہیز ہو گا ہی نہیں۔ وہ بڑی جذباتی ہو گئی۔

اس وقت فہمیدہ سگم بھی آکر بیٹھ گئیں۔ اور پلنگ پوش کے پھول دیکھ کر

بولیں۔

ماشاء اللہ نمو کے ہاتھ میں صفائی بہت ہے۔

آاں۔ نمو کا جہیز میں بناؤں گی۔ ناہید نے کہا۔

ہاں بیٹی۔ جانے فہمیدہ سگم کیوں اُداس ہو گئیں۔ اور پھر فوراً بولیں۔

اللہ اس کا نصیبہ اچھا کرے۔ جس گھر جائے گی۔ اُجالا ہو جائے گا۔

نمو ایک ہوک بھر کے رہ گئی۔

اماں بھائی جان کی شادی کب کر رہی ہیں آپ؟ ناہید نے پوچھا
 نموکا دل چاہا کہ وہاں سے اٹھ جائے۔ وہ اب یہاں سے بھاگنا چاہتا تھا
 بس بیٹی۔ اب فوراً ہی اس کی شادی بھی ہوگی۔ ٹہرا رہی شادی کے
 بعد اکیلے کہاں رہا جائے گا مجھ سے۔ رشیدہ نہیں مانتی۔ ورنہ میں تو
 اپنے گھر نموکو لے آؤں۔ بھائی کی شادی کا انتظام بھی کرے گی۔ مگر
 بنجر کے آجانے کے بعد وہ بھی اکیلی رہ جائے گی۔ ایک ہی بیٹی ہے
 اس کی بھی۔

یوں لگتا تھا جیسے ایک ایک لفظ آگ میں بنا ہوا ہے اور نموکے
 جسم پر داغ ہوتے جا رہے ہیں۔

اماں۔ جانے کیوں بنجر مجھے اتنی اچھی نہیں لگتی۔ ناہید بولی۔
 لڑکی اچھی ہے۔ اس کی ماں ذرا سخت ہے۔ اسی کی تربیت کا اثر
 ہے۔ یہاں پر اگر ٹھیک ہو جائے گا۔ دیکھا تم نے مجھ سے کتنا پیار کرتی
 ہے۔ انشاء اللہ اچھی ثابت ہوگی۔

نموکے ہاتھ میں سوئی چبھ گئی۔ وہ آہ کر کے رہ گئی۔ مگر اس آہ
 میں دل کی چھین زیادہ تھی۔

کیا ہوا؟

سوئی چبھ گئی ہے۔

چھوڑو اب یہ کام۔ ناہید بولی۔
 اؤں۔ ہوں۔ آج یہ کام مکمل کر دوں گی۔ نموکے کہا۔
 فہیدہ بیگم کھانے کا انتظام دیکھنے چلی گئیں۔
 وہیں بیٹھے بیٹھے ناہید نے حسرت کو آواز دی۔
 جی بیٹا۔ حسرت بوا پلو سے ہاتھ صاف کرتی ہوئی قریب آگئی۔
 بوا۔ چاول مجھے بہیں لادو۔ اور بنجنی میں نے پڑھا دی ہے۔ بھیتا
 گل جا رہے ہیں ناخصیں پلاؤ بہت اچھا لگتا ہے۔
 اچھا بیٹا۔ حسرت واپس چلی گئی۔
 ناہید پھر باتیں کرنے لگی۔ مگر نموکھوئی ہوئی تھی۔
 حسرت چاول تھال میں ڈال کر لے آئی۔ ناہید وہیں صاف کرنے لگی۔
 اس لمحے منصور آگئے۔ اور ان کے قریب آ بیٹھے۔
 آپ کل واقعی جا رہے ہیں۔ بھائی جان۔
 ہاں کل صبح کی ٹرین سے جاؤں گا۔
 معلوم ہوتا ہے آج پلاؤ پک رہا ہے منصور دوبارہ بولے۔
 جی ہاں۔ ناہید منہس پڑی۔
 میں چلی آپ کو بھوک لگی ہوگی۔ ناہید نے کہا۔
 ہاں۔ جلدی لکھاؤ۔

ناہید فقال اٹھا کر چلی گئی۔ تو منصور بولے۔

نمو۔

جی۔

کل میں جا رہا ہوں۔ اور آج تم سے خوب باتیں کرنا چاہتا ہوں۔

مگر ناہید۔

تم ہمت کیا کرو۔ مجھ دل مت بنا کرو۔

تو۔؟

رات دل والوں کی راز دار ہے۔

اچھا۔

جب تارے چمکنے لگیں۔ اور آسمان پر آدھا چاند اس درخت کے

اوپر پہنچ جائے۔ تو تم آ جاؤ۔

ہوں۔

آپ جانیے اب۔ خالہ جان آرہی ہیں۔ نمونے کہا۔

اچھا صاحب۔

منصور اپنے کمرے کی طرف چلے گئے۔

دن گزر گیا۔

اور بہت جلد۔

سارا دن منصور گھر رہے۔ ناہید بھی شامل رہی۔ مگر بظاہر وہ دونوں

ناہید سے باتیں کرتے۔ مگر دونوں کی باتیں ناہید نہ سمجھ سکی۔

اور پھر رات آگئی۔

ناہید اور نموکہ منصور کچر دیکھنے ساتھ لے گیا تھا۔ جب وہ واپس

آئیں۔ تو بڑی طرح تھکی ہوئی تھیں۔ دونوں ہی سو گئی۔

نیند نے نموکہ بھی لپیٹی۔ لپیٹ میں لے لیا۔ وہ نیند کی حسین وادیوں

میں منصور کے ساتھ گھوم رہی تھی۔ اور ناہید منصور برآمدے میں اس کا

اس کا انتظار کر رہے تھے۔

کئی گھنٹے بیت گئے۔

سگریٹ کی چار ڈیمیاں ختم ہو گئیں۔ نمونہ آئی۔

وہ وہیں برآمدے میں رکھے ہوئے گملوں کے پاس بیٹھ گئے۔

چاند درختوں کو بہت دور چھوڑ گیا تھا۔ تاروں کی روشنی جوان ہو کر

مانڈ پڑتی جا رہی تھی۔ اور اس وقت نموکہ جاگ پڑی۔ تب وہ بڑی طرح

چوکی۔ منصور کے ساتھ دعدہ۔

وہ جلدی سے اٹھی۔

ناہید سو رہی تھی۔

دبے پاؤں باہر آئی۔ اس کے وہم میں بھی نہ تھا کہ منصور اب تک

اس کے انتظار میں ہوں گے۔

یہ دیکھ کر اُس کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ منصور گلوں کے پاس بیٹھے تھے۔

اس نے اپنے ٹھنڈے برف ان کے کندھوں پر رکھ دیے۔

منو۔ منصور کی گہری اور گہرے آواز ابھری۔

جی۔

اُڑ بیٹھو۔

وہ قریب ہی بیٹھ گئی۔ اور آہستہ سے کہنے لگی۔

میں شرمندہ ہوں۔ مجھے نیند آگئی تھی۔ آپ تمام رات بیدار رہے ہیں۔

میں۔ کہتے ہوئے اس کی آواز بھر آگئی۔

میں نے تم سے کچھ پوچھا تھوڑی ہے۔ وہ مسکرائے۔ مگر اُس کی آنکھوں سے ٹپکڑیں آنسو گرنے لگی۔

پگم۔ اٹھو، نے اس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔ وہ روتی رہی۔ اور منصور اس لے بالوں کو سنوارتے رہے۔

دونوں چپ چاپ تھے۔ رکتے ہی لمحے بیت گئے۔

منو۔

منصور بولے۔

اُس نے اپنی آنکھیں اوپر اٹھائیں۔

صبح ہو رہی ہے۔

ہاں۔

جاؤ اپنے کمرے میں۔

جاتی ہوں۔

وہ معصومیت سے بولی۔

تب منصور نے اس کا ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگا لیا۔

وہ اٹھی۔

تو وہ کہنے لگی۔

میں خالہ جان سے کہوں گا کہ تمہیں ملا لیں اب۔

وہ مسکرا دی۔

خدا حافظ

خدا حافظ

وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی چلی گئی۔

منصور بھی اپنے کمرے میں آگئے۔

دُور کہیں مرغ اذان دے رہے تھے۔

اور ساتھ ہی قریب کی مسجد سے اذان کی آواز سُنائی دینے لگی۔

باہر قدموں کی چاپ سُن کر منو بھی اٹھ بیٹھی۔

حسنت بُرائتیں۔ نمویو نہی گھومتی ہوئی گلوں کے پاس آگئی۔ ڈھیر سا
سگریٹ کے ٹکڑے دیکھ کر وہ تڑپ اُٹھی۔

اور پھر جانے دل میں کیا آئی کہ نیچے بیٹھ کر ٹکڑے جمع کرنے لگی۔
سارے ٹکڑے جمع کر کے وہ انھیں عنفیت سے دیکھنے لگی۔ اور بے اثر
سگریٹ کے ٹکڑوں کو سینے سے لگا لیا۔

(۲۹)

منصور کو گتے چار دن ہو گئے تھے۔ اب منور دل بالکل بھی یہاں نہ لگتا تھا۔
وہ جلد سے جلد ناہید کی چیزیں تیار کرتی رہی۔

اس شام اچانک اس کے چچا آ گئے۔ ہمیدہ سیکم دیر تک اپنے بہنوئی
سے باتیں کرتی رہی۔ ناہید کو ان کے آنے کا دکھ ہوا۔ اور منور کو جانے کیوں
خوشی محسوس ہوئی۔ حالانکہ وہ گھر اس کے لئے جہنم سے کم نہیں تھا۔ مگر پھر بھی
وہ چاہتی تھی کہ جلد سے جلد اس گھر پہنچ جائے۔
ناہید روٹھی بیٹھی تھی۔ نمونہس کر لولی۔

کیوں ناہید۔ منہ کیوں پھولا ہوا ہے۔
ہوں۔ تم تو خوشیاں مناؤ۔

مگر حضور۔ میرا قصور۔
تم ابھی مت جاؤ۔ ناہید تکیے پر سر رکھ کر لولی۔

چچا جان جو آئے ہیں۔
تو کیا ہوا۔ وہ پھر بھی آ سکتے ہیں۔

نہیں ناہید۔ اب مجھے جانا چاہیے۔ پھر آجاؤں گی۔
بہت یاد آؤ گی۔ ناہید کی آواز بھرا گئی۔

منو کا دل خوشی سے جھوم اٹھا۔ اسے اپنی اہمیت معلوم کر کے بڑی ہی خوشی ہوئی کہ اُسے بھی کوئی یاد کرے گا۔ وہ بھی کسی کو یاد آئے گی۔
کیا ہوا۔ ناہید اس کی بدلی ہوئی حالت دیکھ کر ڈرسی گئی۔

کچھ نہیں ناہید۔ تم نے تو مجھے زندہ رہنے کا سبق دیا ہے۔ درد میں تو اپنے آپ کو شاخ بریدہ سمجھنے لگی تھی کبھی ہوئی شاخ جو صرف جلائی جاسکتی ہے۔ جو کبھی ہری نہیں ہو سکتی کبھی نہیں۔

تم کبھی کبھی عجیب باتیں کرنے لگتی ہو۔ جو میں سمجھ نہیں سکتی۔ ناہید درمیان میں بول اٹھی۔

منو کھلکھلا کر منہس پڑی۔ ناہید اور زیادہ حیران رہ گئی۔

شفیق الرحمن اس کے قریب آکر بولے۔

بیٹی۔ اپنی تیاری کر لو۔ صبح چلیں گے۔

اجتہا چا جان۔ منو سر پر دوپٹہ ٹھیک کر کے کہنے لگی۔

خالو جان اتنی جلدی آپ منو کو لے جا رہے ہیں۔ کچھ دن ہی تو ہوئے ہیں۔

پھر آجائے گی کبھی۔ تمہاری خالہ نے تو کئی دن سے اودھم مچا رکھا ہے۔

مسرہ احمد آگئے تھے۔ شفیق الرحمن ان کے ساتھ چلے گئے۔

فہیدہ میٹم رات کا کھانا تیار کروانے لگی۔

منو نے اپنے کپڑے سمیٹ کر کبس میں رکھے۔ تب ناہید ایک خوبصورت ساڑھی لے آئی۔

منو۔ یہ ساڑھی میرا تحفہ سمجھو۔

ناہید تم مجھے بھی رسموں کا پابند سمجھتی ہو۔

نہیں اگر تم نے ساڑھی لوٹا دی تو مجھے دکھ ہوگا۔

منو نے ساڑھی لوٹا دی تو مجھے دکھ ہوگا۔

منو نے ساڑھی لے کر کبس میں رکھ لی۔

اور پھر دونوں صحن میں آگئیں۔

میں نہیں پھر کہہ رہی ہوں۔ تم آخر کیوں کسی سے دیتی ہو تم۔ کسی پر بھاری فٹوڑی ہو۔ جائیداد کی مالک ہو۔ خبردار۔ خالہ جان کے رعب میں مت آنا۔ ناہید نے کہا۔

میں سب کچھ جانتی ہوں ناہید۔ مگر مجھ میں ہمت نہیں۔ اور کچھ پوچھو تو میں چاہتی بھی نہیں۔ کیا کروں گی میں جائیداد کو۔ منو کی آنکھیں کچھ گہری سی ہو گئیں۔ یہی تو تمہاری کم عقلی ہے۔ تمہاری جگہ کوئی اور لڑکی ہوتی تو ناک چنے

چھو ادیتی۔

میں نے تو ایک فیصلہ کر لیا ہے۔ اچانک منو نے کہا کیا فیصلہ۔

”بیٹی قیوم بھی آئے ہیں۔!“
 ”آجائے بھائی جان۔“ نمونے ہنس کر کہا۔

”کیا حال ہے۔ نمونہ ہیں۔؟“
 اچھی ہوں۔ آپ کہتے۔

شکر ہے اللہ کا۔ قیوم ادھر ادھر چھانکتے ہوئے بولے۔
 رضیہ بیگم کو ہمیدہ بیگم نے دیکھ لیا تھا۔ وہ اُن کی طرف چلی گئیں۔
 قیوم وہیں کرسی پر بیٹھ گئے۔

کہو بہن ہمارے ماموں کی بیٹی کا کیا حال ہے۔ وہ مسکرا کر بولے۔
 اچھا ہے۔ نمونہ زور سے ہنس دی۔

سنا ہے شفیق خاں آئے ہیں۔ قیوم نے کہا۔
 جی ہاں۔ کل میں جا رہی ہوں۔

اتنی جلدی، کچھ دن تو اور ٹھہریئے۔

بس جی۔ اب تو چچا جان آگئے ہیں۔ جانا ہی پڑے گا۔

اہو۔ آپ کے جانے کے بعد ہمارے ماموں کی بیٹی کا تو دل نہ لگے گا۔
 اُن کے بھوپھی کے بیٹے کو جو چھوڑے جا رہی ہوں۔ نمونہ ہنس کر کہنے لگی۔

قیوم زور سے ہنس دیے۔

بھائی جان ایک بات کہوں۔

یہی کہ اگر سنجہ کی شادی ہوئی تو اپنا سب کچھ اُس کے نام کر دوں گی۔
 کی بات اُس کی زبان پر آ ہی گئی۔

بالکل ہو تم تو۔ ہمیں ایسا نہ کرنا۔

میں کیا کروں گی۔ نمونہ کی آواز میں بیچارگی تھی۔
 لوگ کیا کرتے ہیں۔

مجھ میں اور لوگوں میں بڑا فرق ہے۔

کیا تم ہمیں شادی نہیں کرو گی۔

”نہیں۔!“

”کیوں۔؟“

”بس۔؟“

جانے دو اتنی تو ہمت نہیں ہے کہ اپنے حق کے بارے میں بول سکو
 پھر بھلا شادی سے کیونکر انکار کر سکو گی۔ ناہید ہنس کر بولی۔
 یہ میرا اپنا معاملہ ہے۔

وہ بھی تو تمہارا ہی معاملہ ہے۔

مگر میری مرضی کا تو سوال ہے۔

اسی وقت رضیہ بیگم صحن میں داخل ہوئیں۔ ناہید دوڑ کر اندر چلی گئی۔
 نمونہ کے استقبال کے لئے آگے بڑھی۔

(۳۰)

”ہماری بہن بے چاری تو بڑی سیدھی ہے۔ مگر آپ تو بڑے چالاک ہیں۔“
چپ رہو جی۔ سیدھی دیدھی نہیں ہیں۔ یہ میں ہی جانتا ہوں۔
رہنے دیں بھائی جان۔

قیوم بیٹا۔ فہمیدہ یکم نے قیوم کو آواز دی۔
میں چلا۔ قیوم ہنسنے ہوئے اس طرف چلے گئے۔
اور نموناہید کی طرف۔
دیکھا اپنے دولہا کو۔
وہ ہنس کر بولی۔
پورے مسخرے ہیں۔
ناہید شرمائی۔
اور دونوں ہنسنے لگیں۔

دوسری صبح نمونہ شفیق الرحمن کے ساتھ واپس چلے آئے۔

”نانکہ جو نہی گلی میں رکا۔ گلو لپکا کر آگے آگیا۔
آگئیں آپ۔ بی بی جی۔
ہاں گلو۔ سناؤ تمہارا کیا حال ہے۔ نمونہ سے بولی۔
آپ بہت یاد آئیں بی بی جی۔ گلو کبس اُتارتے ہوئے بولا۔
”تم بھی مجھے بہت یاد آتے رہے۔
وہ برفہ سنبھالتی ہوئی چچا کے ساتھ گھر میں داخل ہوئی۔ وہی گھر
وہی سرخ اینٹوں کا فرش اور برآمدے میں لگی ہوئی چینی کی سیل وہی
صحن میں بڑا سا تخت پوش۔
اس کی چچی سامنے ہی کھڑی تھیں۔
وہ دوڑ کر ان سے لپٹ گئی۔
”تم تو جا کر بیٹھ ہی گئیں۔ تم نے شکر کیا ہوگا۔ پر اے گھر میں یوں نہیں
بیٹھ رہا کرتے۔ وہ اسے علیحدہ کرتے ہوئے بولیں۔
یہ اُس کا استقبال ہو رہا تھا۔ پہلا نشتر تھا جو آتے ہی چمھو یا گیا تھا۔

بچی - مجھے کوئی لینے ہی نہ گیا۔ وہ بہم کر بولی۔

اے تو ہمارے ساتھ ہی آ جاتیں۔ میں جانتی ہوں تم نے ناہید کو بچی پڑھائی تھی۔ میں مجبور ہو گئی۔ نجمہ کی خالہ کا گھر ہے۔ مگر وہ اتنی بے تکلف نہیں۔ کیا مجال جو مجھ سے پوچھے بغیر کوئی کام کر جائے۔ مگر تم ہو کہ ایک دم اپنی جاگیر سمجھ کر بیٹھ رہیں۔ بہن کی مروت میں بھلا میں اور کیا کہتی۔ اتنا تم نے نہ سوچا کہ وہ نجمہ کا سسرال بھی ہے۔

نمو کا برقعہ ابھی مڑ رہا تھا۔ وہ کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔
شفیق الرحمن قریب آ کر بولے۔

برقعہ ابھی نہیں اُتارا۔ جاؤ بیٹی تہا دھولو۔ سفر سے آئی ہو۔

تب وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی اپنے کمرے میں آ گئی۔ جہاں پر گلو پہلے ہی کھڑا تھا۔

کمرہ دیکھ کر اُسے اور بھی دکھ ہوا۔ جو بھی اچھی چیزیں تھیں وہ اٹھالی گئی تھیں۔ صرف ایک چارپائی۔ اس کا بستر اور ایک ٹوٹی ہوئی میز تھی۔ جس پر اس کی کتابیں بکھری ہوئی تھیں۔

آپ کی تمام چیزیں نجمہ بی بی نے اٹھا لیں۔ گلو اُسے یوں کھڑا دیکھ کر دلا۔ اُس نے چپ چاپ برقعہ اُتارا۔ کھنٹی پر لٹکا کر وہ اپنی چارپائی پر بیٹھ گئی۔

تو اب یوں کام نہیں چلے گا۔ کل سے مجھے زبان کھولنی ہو گی۔ ناہید سیدھی کہتی تھیں۔ اگر میں یہاں سے نکل بھی گئی تو کیا ہوا۔ میں اپنی زندگی بنا سکتی ہوں۔

وہ کہتی دیر تک منصوبے بناتی رہی۔

آگئیں۔ مختصرہ۔ نجمہ کمرے کے دروازے پر کھڑی ہو کر بولی۔

آؤ نجمہ۔ کہو کیا حال ہے۔ نمو اخلاقاً اٹھی۔

تم سناؤ خوب عیش کر کے آئی ہو گی۔ نجمہ کے لہجے میں طنز تھا۔

ناہید اور خالہ تمہیں بہت یاد کرتی تھیں۔ نمو طنز نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔

بڑی اچھی خیر سنائی تم نے۔ ویسے ارکان تو نہیں۔

زلزلہ کب آ رہا ہے۔ نمو نے بات بدلنا چاہی۔

وہاں پر معلوم نہیں ہو سکا کیا؟

تمہاری ان باتوں کا مطلب۔ نمو کو غصہ آ گیا۔

وہی جو تم سمجھتی ہو۔

”کیا۔؟“

مجھے معلوم نہ تھا کہ تم عجیب سی لڑکی ہو۔ مجھے سب معلوم ہو چکا ہے کہ تم جو تم بھائی کی خاطر رہی تھیں۔ ہمارا نہیں تو ناہید اور خالہ جان کا خیال

کرنا تھا۔

نمو کا رنگ غصے سے سرخ ہو گیا۔ وہ زور سے چیخی۔
نجمہ۔

ایک لمحہ کے لئے سہم گئی۔

نمو کی آنکھوں سے جیسے شے نکل رہے تھے۔

پھر وہ اپنا منہ ہاتھوں سے چھپا کر زور زور سے رونے لگی۔ رشیدہ بھی آگئیں۔

یہ کیا ہو رہا ہے۔ آتے ہی سخت شروع کر دی ہے۔ یا اللہ میں کس مصیبت میں پھنس گئی ہوں۔

نجمہ اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔

رشیدہ بھی بڑبڑاتی ہوئی چلی گئی۔ اور نموجی بھر کر روتی رہی۔ اُسے اس الزام کا براؤ دکھ ہوا تھا۔ کتنی دیر تک وہ کمرے سے باہر نہ نکلی۔ شام ہو رہی تھی۔

باہر منصور کی آواز آنے لگی۔

خالہ جان۔ خالو آگئے ہیں کیا۔ منصور کی آواز آئی۔

”ماں بیٹا آگئے ہیں۔ باہر گئے ہیں کہیں“ رشیدہ کی آواز تھی۔ نمو بھی آئی ہے۔

منصور پوچھ رہے تھے۔ ہاں وہ بھی آئی ہے منصور نجمہ کی آواز آئی۔ اور پھر منصور کسی بات سے انکار کر رہے تھے۔ اور نجمہ اصرار کر رہی تھی۔ آج نہیں نجمہ۔ بہت تھک گیا ہوں۔
ٹھیک تو کہہ رہے ہیں۔ کل چلی جانا۔ رشیدہ کی آواز آئی۔
اور پھر آوازیں آنا بند ہو گئیں۔ شاید منصور اپنے کمرے میں چلے گئے تھے۔

نمو ابھی تک اپنے کمرے میں تھی۔ رات ہو گئی۔ شاید باہر لوگ کھانے پر بیٹھے تھے۔ گلو اسے بلانے آیا۔

کھانے پر آپ کو بل رہے ہیں۔

گلو۔ مجھے بھوک نہیں۔ جاؤ کہہ دو۔

گلو نے جب جاکر کہا۔ تو منصور زیادہ حیران ہوئے۔ شفیق الرحمن کہنے لگے۔ پھر کوئی بات ہوئی ہے کیا۔

اے۔ تم تو ہمیں ہی قصور وار ٹھہرانا۔ رشیدہ جل کر بولیں۔

کیا بات ہوئی ہے نجمہ۔ شفیق الرحمن میٹھی کی طرف دیکھ کر بولے۔

سچہ نہیں آبا جان مجھے تو علم نہیں۔ نجمہ صاف بکھر گئی۔ جاؤ گلو۔ پھر کہو۔

یا ٹھہرو۔ شفیق الرحمن خود ہی اٹھے۔ اور حقوڑی دیر بعد جب نمو ان کے سامنے

آئی تو منصور پہلی نظر میں پہچان گئے کہ نمو بہت زیادہ روٹی ہے۔

آنکھیں سوچی ہوئی تھیں اور مشکل کھل رہی تھیں۔

ناک بھی سرخ ہو رہی تھی۔ وہ صرف ایک نظر دیکھ کر رہ گئے۔

نمونے برائے نام ہی کھانا کھایا۔ اور اُمٹھ کر اپنے کمرے میں آگئی۔ صحن میں اب کوئی نہ سوتا تھا۔ کیونکہ خشکی بڑھ گئی تھی۔ سب اپنے اپنے کمرے میں ہی سوتے تھے۔

باہر سے آوازیں آنا بند ہو گئیں۔ اور پھر سنا چھا گیا۔

دور کہیں بادل گرج رہے تھے۔ نمونہ کو اپنے کمرے کا اندھیرا ڈرا رہا تھا۔ کئی گھنٹے بیت گئے۔ وہ یونہی اندھیری سیم زدہ چھت کو گھورتی رہی۔ ایک ایک اس کے کمرے میں آہٹ معلوم ہوئی۔ اس نے چونک کر دیکھا۔ سایہ دیکھ کر وہ پہچان گئی۔ کہ سایہ کس کا ہے۔ وہ اُمٹھ کر بیٹھ گئی۔ نمونہ آنے والے منصور تھے۔

جی۔

منصور اس کے قریب ہی بیٹھ گئے۔

کیا بات ہے سارا دن باہر نہیں نکلیں۔

کوئی بات نہیں۔ نمونہ آہستہ سے بولی۔

تم روٹی کیوں نہیں۔

آپ سے کس لئے کہا۔

تمہاری آنکھوں نے۔

یہ نہیں۔

کچھ نہ ہوگا۔

نمونہ سسک پڑی۔

کیا ہوا۔ منصور اس کا سر تھپتھپاتے ہوئے بولے۔

منصور خدا کے لئے مجھے یہاں سے لے چلتے۔ یہ لوگ مجھے مار ڈالیں گے۔

یہ مجھ پر طرح طرح کے الزام بھی لگانے لگے ہیں۔ یہ لوگ مجھے مار ڈالیں گے۔

منصور خدا کے لئے مجھے بچا لو منصور۔ ایک لاوا تھا جو پہرہ دکھا۔

منصور اسے سینے میں چھپاتے۔ تسلیاں دیتے رہے۔

حوصلہ نہیں ہارا کرتے نمونہ۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ دنیا ادھر کی ادھر

ہو جائے۔

منصور کو ٹم سے کوئی جُدا نہیں کر سکتا۔ میں اس کا جلد ہی فیصلہ کرنے

والا ہوں۔ کچھ دیر اور صبر کرو۔ بس کچھ دیر اور۔ مجھے امید ہے اتنی میری بات

مان لیں گی۔

منصور اس نے تڑپ کر سر اٹھایا۔

ہاں۔ میری اپنی نمونہ۔ وہ اس کے آئینہ صاف کرتے ہوئے کہنے لگے۔

مگر منصور۔ ایسا نہیں ہوگا۔ میں بڑی بد نصیب ہوں۔ بھلا ایسا بھی

کبھی ہو سکتا ہے۔ یہ تو میں بھول کر بھی نہیں سوچ سکتی۔

تمہیں سوچنے کی ضرورت بھی نہیں۔ تم یہ رونا دھونا چھوڑ دو۔ مگر منصور وہ ایسی باتیں کرتی ہیں جو میں برداشت نہیں کر سکتی۔ اب دیکھئے ناخنہ لے کتنی بُری بات کی ہے۔ الفاظ ہچکیاں بن کر اس کے منہ سے نکل رہے تھے۔

کیا بات۔ منصور چونک سے گئے۔

وہ۔ وہ کہتی ہے کہ میں قیوم بھائی۔ اور آگے کے الفاظ آسموؤں نے روک دیے۔ بہت ذلیل لڑکی ہے۔ تم پردہ نہ کرو۔ یہ سب حسد کی وجہ سے کرتی ہے وہ

کافی دیر تک منصور اسے سمجھاتے رہے۔ وہ روتی رہی۔ اور پھر جب صبح کی سفیدی پھیلنے لگی تو منصور اپنے کمرے میں چلے گئے۔ منصور کے جانے کے بعد کسی جاننے کے بعد کسی جاننے کے بعد کسی حد تک اس کا ذہنی بوجھ کم ہو گیا تھا۔ وہ سکون سے لیٹ گئی۔ اُسے ایک ہی تسلی تھی کہ کوئی تو اس کا ہے۔

باہر چڑیاں چیچکا کر صبح کی آمد کا اعلان کر رہی تھیں۔ وہ اٹھ کر باہر آ گئی۔ باورچی خانے میں آگ جلا کر پانی گرم کیا۔ اور پھر وضو کر کے سکون سے نماز ادا کی۔

آج اُس نے پہلی مرتبہ صدق دل سے دعا کی منصور کہ مالینے کی دُعا

اپنی محبت کی کامیابی کی دعا اپنی زندگی کی خوشیوں کی بھیک مانگی تھی۔ اللہ سے اور اس دعا کے بعد اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کی یہ دعا پوری بھی ہو سکتی ہے۔ اس کی محبت کامیاب ہو جائے گی۔ وہ منصور کو پالے گی۔ اسے زندگی کی خوشیاں مل جائیں گی۔

واپس باورچی خانے میں آکر وہ کام میں لگجھ گئی۔ اس کے چہرے پر حوروں کا سا تقدس تھا۔

تو آ رہا ہے۔! ” اچھا تو پھر کل ہماری دونوں بیٹیاں ایک دم ہمیں مٹھائی کھلانے والی ہیں۔“

” مجھے تو سچہ کی امید ہے۔ مگر تو خاص نہیں پڑھتی تھی۔ پڑھائیاں کہیں یوں بھی ہو کر تھیں۔“

” رشیدہ چائے پیالی میں انڈیلنے ہوئے بولیں۔

” کیوں۔ دل چھوٹا کرتی ہو لڑکی کا۔ اللہ نے چائے تو ضرور پاس ہوگی۔ شفیق الرحمن کو رشیدہ کے الفاظ بڑے لگے۔

” دیکھ لینا۔! ” رشیدہ بولیں ” چچا جان۔“ ” تموجی کڑا کر کے بولی۔

” کیا ہے بیٹی۔“

” چچا جان۔ وہ مکان کا کرایہ کتنا آتا ہے جہینے کا۔“ آخر اس نے پوچھ ہی لیا۔

” مکان کا کرایہ۔“ شفیق الرحمن کچھ حیران سے ہو گئے۔ رشیدہ اور سچہ کے کان بھی کھڑے ہو گئے۔

” جی ہاں۔ اُس کا مجھے حساب دیکھیے۔“

” اللہ کی شان۔ میری تو کوئی سنتا ہی نہیں۔ میں تو پہلے ہی کہہ رہی تھی۔

” آستین میں سانپ پال رہی ہوں۔ نشا بٹن ہے لڑکی سچہ پر۔ چچا سے حساب مانگ رہی ہے۔ اور سچہ کھاتی ہے۔ کس کی کمائی ہے۔“

” اندھیر خیر کا کن دیدوں سے کہہ دیا۔ حساب دیکھیے۔“

(۳۱)

اور پھر زندگی اُسی ڈگر پر چل نکلی۔ ستمو کاموں میں الجھ گئی۔ طعنے اس کا جگر چھلنی کرتے رہے۔ ستمو منصور کی میٹھی نظریں۔ جیسے اُن زخموں پر ہم کام کر رہیں۔ وہ دن بھر عجی اور سچہ کی جلی کٹی سنتی۔ اور شام کو منصور کی الما نظریں جیسے انگاروں پر بانی چھٹک دیتیں۔

وہ تو بھئی ایک کمزور اور بزدل لڑکی۔ اکثر رو پڑتی۔ کئی منصوبے بناتی کبھی کبھی تو وہ فیصلہ کر لیتی۔ کہ اپنی جائداد کا فیصلہ کرنا کر علیحدہ ہو جائے۔ مگر جو نہی وہ زبان کھولنے لگتی اُسے یوں لگتا جیسے زبان خشک ہو گئی ہے۔ حلق میں کانٹے پڑ گئے ہیں۔ اور پھر وہ گھٹ کر رہ جاتی۔

آج اُس نے بڑا پکا فیصلہ کر لیا تھا کہ اس سلسلے میں ضرور کچھ کہے گی۔ سہ پہر کو سب تخت پر بیٹھے تھے۔ صرف منصور نہیں تھے۔ وہ چائے لے کر آئی تو سچہ کے پاس آ بیٹھی ”کیا بات ہے بیٹی۔“

” رزلٹ کتب آیا ہے۔“

” شفیق الرحمن کی ہمدرد باتیں پھر اُس کے فیصلے کو ڈگمگا رہی تھیں۔ ”جی کی ہاں“

رشیدہ کو جیسے ماچس دکھا دی تھی۔

”ہاں۔ جی۔ مجھے حساب چاہیئے۔!“ تم غصے سے بولی۔

”اے۔ میں کہتی ہوں۔ اب چپ کیوں ہو گئے ہو۔ ۹ دو حساب مالک کو؟“ رشیدہ شوہر کے گرد ہو گئیں۔

”مجھے تم سے یہ امید نہ تھی تمہو۔!“ شفیق الرحمن بھی تمہو کی اس بات پر ہنسنے لگے۔

اس میں ناراض ہونے کی تو بات ہی نہیں۔ میرا حق ہے۔ میری جائداد ہے۔ میں اب زیادہ ظلم برداشت نہیں کر سکتی۔ میں نے چچی جان کی ہمیشہ خدمت کی۔ مگر انھوں نے کبھی میرے سر پر ہاتھ نہ رکھا۔“ کہتے ہوئے اس کی آواز بھر اگئی۔

”مگر میں تمہارا چچا ہوں۔ اور سمجھ لو تو باپ بھی۔ تمہیں یہ الفاظ منہ سے نہیں نکالنے چاہیئے تھے۔ شفیق الرحمن ذرا غصے سے بولے۔

”چچا جان۔ خدا کے لئے آپ غلط مت سمجھئے۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ علیحدہ رہ کر کوئی اصلاح و بہبود کا ادارہ کھول لوں گی۔ کم از کم زندگی کے چار دن تو آرام سے کٹ جائیں گے؟ تمہو کے آسنو الفاظ کے ساتھ ٹپ ٹپ کرتے جا رہے تھے۔

”اے۔ تو کیا ہم نے تم کو سولی پر چڑھایا ہوا ہے۔ اُلٹا تم کلک کرتی ہو۔ حالانکہ جس دن سے تم آئی ہو۔ چین کا ایک دن تو گذارتیں۔

”اسی لئے میں اپنے آپ کو علیحدہ کر لینا چاہتی ہوں۔ چچی جان۔!“ تمہو نے رشیدہ کی بات درمیان میں روک دی۔

”جائداد میں کیا ان کا ہی حصہ ہے۔ اور کسی کا نہیں۔ ۹ اب کچھ بولی۔“ نہیں۔ یہ نام نہ لو۔ یہ ہی تو ہے ایک لاڈلی مین لو اس بات کا کبھی سوچنا بھی منت نہیں ایک چیز بھی نہیں مل سکتی۔ قانوناً تمہارے چچا وارث ہیں! وہ صرف آسنو بہاتی رہی۔

”یکبھی نہیں ہو سکتا۔ کہ تم اکیلی رہو۔ میرے جیتنے جی یہ کچھ نہیں ہو سکتا۔ پاگل پن کی باتیں چھوڑو۔ اور آئندہ کبھی ایسی بات منہ سے نہ نکالنا۔ باقی رہا گھر کا ماحول تو میں اس کا جلد انتظام کروں گا۔ شفیق الرحمن سخت لہجے میں کہہ رہے تھے۔ نجمہ ہنس کر رہ گئی۔

اور رشیدہ اُسے کو سے ہوئے اٹھ کر کمرے میں چلی گئی۔

دیکھو بیٹی۔ تم میرے لئے سب کچھ برداشت کرو میں جانتا ہوں۔ نجمہ اور تمہاری چچی کی نہیں بنتی تمہارے ساتھ۔ مگر وہ دونوں تو بے وقوف ہیں۔ تم تو عقلمند ہو۔ اور ایسا تو کبھی ہمیں ہو سکتا کہ تم اکیلی رہو۔ لڑکیاں تو ہوتی ہی پر اٹے گھر کی ہیں کچھ عرصے بعد تمہاری شادی ہو جائے گی۔

باہر منصور کی آواز آئی۔

اُسے یوں لگا۔ جیسے اس موسم میں بھی کہیں سے خوشبو اڑ کر اُس کے دماغ کو چھو گئی ہے۔ وہ باہر نکل آئی۔

بجٹہ ادریچی کی تیز نظروں سے پنج کر با درچی خانے میں آگئی۔ چو لھے میں آگ جھمٹ کر گئی تھی۔ نئی لکڑیاں لگا کر اُس نے آگ دوبارہ تیز کر دی اور بوہتی چو کے پر بیٹھی راکھ کھدینے لگی۔

”تمو۔ ۹“ دروازے پر منصور آکھڑے ہوئے۔
”جی۔ ا!“

”گلاس چاہیے۔ ۹“

”لیجئے۔ ا!“ اُس نے گلاس اُسے تھما نا چاہا۔

لیکن منصور نے گلاس کو جگہ اُس کا ہاتھ مقام لیا۔

”تمو۔ میری تمو۔ ا!“ اُن کا آواز جذبات سے ٹھرا رہی تھی۔

”چھوڑیے۔ ۹ کو کوئی آجائے گا۔ ا!“

”تہیں چھوڑوں گا۔ وہ اس کا منہ چڑا کر بولے۔“

”چھوڑیے۔ ۹“ اُس کا آواز آنکھوں میں بھی لمحہ بھر کو چمک آگئی۔

اُس لمحے بجٹہ کی آواز قریب آئی۔

منصور اُس کا ہاتھ زور سے دبا کر مسکراتے ہوئے چلے گئے۔ اُسے پھر

پھر میں تمہاری جائیداد تمہارے چیز میں دے دوں گا۔ میں بے انصاف نہیں ہوں۔ مجھ پر تمہارے حصے کی جائیداد حرام ہے۔ ا!“ وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے خود بھی آبدیدہ ہو گئے۔

”کہو۔ میری بیٹی۔ آئندہ ایسا تو نہیں ہوگا۔ ۹“

وہ بے کسی سے اُن کی طرف دیکھ کر رہ گئی۔

”مجھ سے وعدہ کرو۔ کہ آئندہ تم ایسا بالکل نہیں سوچو گی۔ وعدہ کرو۔ ۹“

شفیق الرحمن اُس کے کندھے تھپتھپاتے ہوئے بولے۔

”ایسا ہی ہوگا چچا جان۔ اب کچھ نہیں کہوں گی۔ ا!“ وہ جذبات میں

کہہ کر تیز قدم اٹھاتی ہوئی اپنے کمرے میں آگئی۔

وہ پتھر سی ہوئی باہر دیکھتی رہی۔

اُسے اپنی قسمت پر بڑی حیرت بھی تھی۔ اتنی بد نصیبی بھی کسی کے حصے میں آسکتی ہے۔ مجھ جیسے لوگ آفر دنیا میں پیدا ہی کیوں ہوتے ہیں۔

موسم بھی بڑا اداس تھا۔ درختوں کے پتے جھڑ رہے تھے۔ زرد زرد

سے پتے۔ جو فوراً چرمر سے ہو جاتے ہیں۔

وہ سہ جھنے لگا۔ کتنی کم زندگی لے کر آتے ہیں یہ پتے۔ اُسے یہ موسم اپنی

ان معلوم ہونے لگا۔ وہ بھی تو خزاں ہی تھی اُس کے مقابلہ

ہی بھری ہوئی تھیں۔

زندہ رہنے کی تمنا پیدا ہو گئی۔

منصور اُس کی رگ و جان میں سما ناچار رہا تھا۔ اگر منصور سنجہ کو مل گیا تو کیا پھر وہ جی سکے گی۔ اُس کے ذہن میں ایک خیال ابھرا۔

پھر جینا کس کام کا۔ آج کل وہ زیادہ ہی اپنے بارے میں سوچنے لگی تھی۔ کھانے پر رشیدہ نے پھر بے نیکی باتیں چھیڑ دیں۔ وہ منصور سے پوچھنے لگیں۔

”بیٹا۔ آج کل تو جہیز میں کاریں لڑ کے مانگتے ہیں۔ تمہارا اس بارے میں کیا خیال ہے۔“

”ویسے خالہ۔ میری اگر رائے پوچھیں۔ تو میں جہیز کے بالکل خلاف ہوں۔“ منصور نے جواب دیا۔

”اے۔ وہ کیوں بیٹا۔“

”دیکھئے ناخالہ۔ ایک تو لڑکی دی جائے۔ اُس پر اتنا جہیز بھی جس بیچا کر کے تین چار لڑکیاں ہوں۔ وہ تو زندہ درگور ہو گیا۔“

”وہ تو ٹھیک ہے۔ مگر یہ رسم تو جلی آتی ہے۔ اور اب ہر ایک کو کرنا ہی پڑتا ہے۔ اب دیکھ لو۔ آپا نے ناہید کے لئے کتنا کچھ بنایا ہے۔ سنا ہے قیوم کو نقد دے رہی ہیں۔“

”جتنے نہیں۔ مجھے تو نہیں کہا انھوں نے۔“ منصور اس ذکر کو ختم کرنے

لے لئے بولے۔

”رشیدہ ابھی کچھ اور کہنے والی تھیں۔ کہ منصور بول اٹھے۔“ میں کچھ دنوں بعد اُتی کے پاس جا رہا ہوں۔ چھٹی لے کر۔“

”اچھا ہے بیٹا۔ ہو آؤ۔ تمہاری ماں کا کلیجہ ٹھنڈا رہے۔“

شفیق الرحمن جلدی میں اُٹھ گئے۔

”کیوں آجا جان۔ آپ نے کھانا نہیں کھایا۔“ سنجہ نے پوچھا۔

”طبیعت ٹھیک نہیں کچھ۔“ شفیق الرحمن بولے۔

”بخار و حار ہے کچھ۔“ رشیدہ بولیں۔

”نہیں بخار تو نہیں۔ یوں ہی کچھ طبیعت بوجھل ہے۔“

”میں گولی دیتا ہوں ابھی۔“ منصور بھی اُٹھ کھڑے ہوئے۔

”تمہ کو نے میں میٹھی تھی۔ اٹھ کر چپا کے کمرے میں گئی اور اُن کا سر دبانے لگی۔“

منصور بھی گولی اور دودھ کا گلاس لیے وہیں آ گئے۔

”تمہ کو بیٹھا دیکھ کر وہ وہیں بیٹھ گئے۔ سنجہ اور رشیدہ بھی آ گئیں۔“

”رشیدہ نے آنکھوں ہی آنکھوں میں سنجہ سے کہا کہ تمہ کو مکاریاں دیکھ لے۔“

”سنجہ مسکرا کر رہ گئی۔ کافی رات تک محفل ہی رہی۔“

”تمہ سے کسی نے بات نہ کی۔ وہ چپ چاپ اُٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ اُس کے

جانے کے بعد منصور بھی اُٹھ گئے۔“

”کیا زلٹ آیا ہے۔“

”ہاں۔ مگر مٹھائی پہلے۔!“

”ہائے اللہ۔ دکھائیے نا۔“ ”تجملہ جھٹلا سی گئی۔“

”اؤں ہوں۔“

وہ تلو کی طرف دیکھ کر بولے۔

”ہائے اللہ۔ منصور خدا کے لئے دکھائیے نا۔“

تجملہ عاجزی سے کہنے لگی۔

”بیٹا۔ کیوں تنگ کرتے ہو۔“ رشیدہ ہنس کر بولیں۔

”یہ لوبیہ تجملہ۔!“ منصور نے اخبار کا ایک صفحہ تجملہ کی طرف بڑھا دیا۔

وہ گھبراہٹ میں اپنا رول نمبر ڈھونڈنے لگی۔

”ارے پاس ہو گئی ہو۔ گھبرا کیوں رہی ہو۔!“ منصور نے کہا۔

”متو صاحبہ۔ آپ بھی آئیے نا۔ آپنے کو اپنے زلٹ کا انتظار نہیں کیا۔“

منصور اُس کی طرف دیکھ کر بولے۔

وہ مسکرا کر قریب آگئی۔

”آپ کا رول نمبر۔“ حالانکہ منصور کو وہ رول نمبر زبانی یاد تھا۔

”جی۔ سترہ سو چالیس۔!“ وہ مسکرا کر بولی۔

وہ اپنی مسکراہٹ ہونٹوں میں چھپانے کی کوشش کرنے لگا۔

(۳۲۱)

جس دن سے جائداد کی بات ہوئی تھی۔ تجملہ اور چچی کی نظروں میں تلو کے لئے اور بھی حقارت اور نفرت آگئی تھی۔

تجملہ تو اس سے بات کرنا اپنی توہین سمجھتی تھی۔

زلٹ کچھ اور لیٹ ہو گیا تھا۔

وہ صحن میں بیٹھی سبزی کاٹ رہی تھی۔ کہ منصور صبح ہی آگئے۔ ابھی انھیں

اسپتال گئے دو گھنٹے ہوئے تھے۔

”خالد جان۔ ادا دھرتیئے۔“ وہ آتے ہی چلائے۔

”کیا ہوا بیٹا۔“

”رشیدہ گھبرا کر باہر نکل آئیں۔“

”اخبار کھولتے ہوئے وہ وہیں تخت پوش پر بیٹھ گئے۔“

”مٹھائی لائیے۔“

”تجملہ بھی بھاگی آئی۔“

نصوہ کی نگاہوں کی عقیدت ہی اس کے لئے کافی تھی۔ وہ اپنی دادی
 یاد کر کے کچھ پریشان سی ہو گئی۔ جب وہ پاس ہوا کرتی تھی تو وہ میلا د
 دیا کرتی تھی۔ سارے محلے میں خوشی خوشی خود ہی مٹھائی باٹا کرتی تھیں۔
 رشیدہ اندر چلی گئیں۔ اور روپے دے کر گلو کو بازو بچھ دیا۔ تمو
 ہنری کاٹ چکی تھیں۔ مادودن سے بیمار تھی۔ کام تمو کے سر پر تھا۔
 وہ منصوہ کی طرف دیکھتی ہوئی باورچی خانے کی طرف چلی گئی۔ رشیدہ
 مٹھائی منگوا چکی تھیں۔ پلیٹ میں رکھ کر پہلے اُس نے منصوہ کے لگے رکھی۔
 منصوہ کو اُس وقت تمو کی بد نصیبی بڑی طرح کھٹک رہی تھی۔
 بے چاری لڑکی۔ کسی کو بھی تو اُس کے پاس ہونے کی خوشی نہ تھی۔
 نے پھوٹے منہ مبارک باد بھی نہ دی تھی۔ اور پڑھائی بھی تو اپنی
 نت پر کرتی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ امتحان کے دنوں میں بھی اُس نے کسی سے مدد
 لی تھی۔ اور اتنے کام کے باوجود وہ پڑھتی رہی تھی۔ کاش وہ اُس کے
 اس ہونے کا جشن مناسکتا۔
 ”کس سونچ میں کھو گئے بیٹا۔“ رشیدہ انھیں یوں گم سم دیکھ کر بولی۔
 ”میرے پاس ہونے کی خوشی نہیں ہوئی۔ اماں۔!“ نجمہ نے فقرہ جڑ دیا۔
 ”نہیں۔ یہ بات نہیں۔ یہ مٹھائی۔ لایے خالہ جان جمنہ میٹھا کر گئیں۔“
 منصوہ چونک سے گئے۔

”اماں۔ میں پاس ہو گئی۔!“ نجمہ خوشی سے چلائی۔
 ”مائے اللہ تیرا شکر ہے۔ گلو کہاں گیا تو۔ جا بھاگ کر مٹھائی لے آ۔
 نیاز دوں گی۔ رشیدہ وہیں سے چلائیں۔“
 اس دوران منصوہ نے اخبار نمک پھندا دیا۔ اپنے رول نمبر پر مخرج
 پینسل کا نشان لگا دیکھ کر وہ سمجھ گئی۔ کہ منصوہ پہلے ہی اُس کا رزلٹ دیکھ
 چکے ہیں۔
 ”مبارک۔!“ وہ آہستہ سے بولے۔
 اُس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اُن کا شکریہ ادا کیا۔ اور اخبار ایک طرف
 کو رکھ دیا۔
 ”خالہ۔ تمو صاحبہ بھی پاس ہو گئی ہیں۔! منصوہ رشیدہ سے بولے۔
 ”جھلو۔ اچھا ہوا۔!“ اُن کے لہجے میں جلن صاف نمایاں تھی۔
 ”ویسے تمو صاحبہ نے نجمہ سے زیادہ نمبر لئے ہیں۔ یہ فرسٹ ڈویژن
 میں ہیں۔ منصوہ ہنس کر بولے۔
 نجمہ اور رشیدہ بڑی طرح جل گئیں۔
 ”مبارک ہو نجمہ۔!“ تمو خلوص سے بولی۔
 ”شکریہ۔!“ نجمہ کی آواز میں بے مری زیادہ تھی۔
 نجمہ کو تو سب نے مبارک باد دی۔ مگر تمو کو کسی نے پوچھا بھی نہ۔

”اچھا تو کامیابی کا کیا تحفہ دے رہی ہیں آماں۔ آپ۔ ۹۔“
 ”نجمہ منہس کر کہنے لگی۔“

”کیا لوگی۔ ۹۔“

”لاکٹ خوبصورت سا۔!“

”بھٹی کوئی سستی چیز کہو۔ ۹۔“

”نہیں آماں لاکٹ۔ ۹۔“

”تو نہیں مانے گی۔!“

”کیا ہوا۔ ایک ہی تو بیٹی ہوں آپ کی۔ اکیلی بیٹی تو بے حد لاڈلی
 ہوتی ہے!“

اور منصور سوچنے لگے۔

”نہو بھی تو اکیلی ہی ہے۔ وہ کیوں لاڈلی نہیں۔“

”اچھا بابا لے لینا۔ آج بازار چلنا۔ لے دوں گی۔!“ رشیدہ بولیں

اور ڈاکٹر صاحب۔ آپ کیا دے رہے ہیں میں۔ ۹۔“ اب کے

”نجمہ منصور سے مخاطب ہوئی۔“

”میں۔ جو تم کہو۔!“ منصور بولے۔

”جو آپ کی مرضی ہو۔!“

”نہیں۔ اپنی مرضی بتا دو۔ ۹۔“

”یہاں پر آپ کے انتخاب کا معاملہ ہے۔ ۹۔“

پھر بھی۔ ۹۔“

”اوں ہوں۔!“

”اچھا تو ہم اپنی مرضی کا پریذیڈنٹ (PRAZANT) خریدیں گے۔“

جی ہاں۔!“

”آماں۔ ۹۔“ نجمہ ماں سے کہنے لگی۔

”اب کیا ہے۔ ۹۔“

”پارٹی ضرور ہونی چاہیے۔ ۹۔“ میری سہیلیاں کیا کہیں گی!“

”ہاں ہاں۔ کر لینا جب جی چاہے۔!“

”تو پرسوں ہی ٹھیک ہے۔ دس بارہ لڑکیاں ہیں۔!“

”اچھا۔!“ رشیدہ وہاں سے اٹھ گئیں۔

”اور جناب۔ ہمیں کچھ کب دکھا رہے ہیں۔ ۹۔“

”جب تم کہو۔!“

”پارٹی کے بعد۔!“

”جیسی تمہاری مرضی۔!“

”نجمہ۔ ایک بات کہوں۔ ۹۔“ منصور کچھ سوچتے ہوئے بولے

”فرمائیے۔ ۹۔“

”برا تو نہیں مانو گی۔“

”کون سی ایسی بات ہے جس کے لئے اتنی تمہید باندھی جا رہی ہے!

”بختمہ۔ میں نہیں ایک بھی لڑکی سمجھتا ہوں!۔“

”بس۔“ بختمہ آنکھیں گھماتی ہوئی بولی۔

”ہاں اور کیا۔ مگر۔!“

”مگر کیا۔“

”مگر تم بھی اپنی عادتیں بدل لو۔ تو اچھا ہے۔!“

”کیا عادتیں ہیں میری۔“ بختمہ کا ہجرتیر تھا۔“

”دیکھو نا۔ بختمہ۔“ منصور اُسے نرمی سے سمجھاتے ہوئے بولے۔

”تم بڑی بھلی ہو عقیقتاً۔ خالہ بے چاری پہلے زمانے کی ہیں۔ اُن کے

دماغ میں وہی کچھ وہم وغیرہ ہیں۔ مگر تم تو جانتی ہو کہ وہم وہم ہے۔ اور حقیقت

حقیقت۔!“

”مگر آپ کا مطلب کیا ہے۔“ بختمہ جھلا سی گئی۔

”میرا مطلب یہ ہے کہ تم اپنی مرضی پر چلو جو تمہارا دل کہتا ہے

وہی کرو۔!“

”مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔!“ بختمہ منہس کر بولی۔

”میرا مطلب یہ ہے کہ تمہارا دل چاہا کی بیٹی ہے۔ کوئی غیر نہیں۔“

”تم خود کم از کم اُس کے ساتھ اپنا سلوک بدل لو۔“

”کیسیا سلوک۔“ بختمہ حل جھن کر کباب ہو گئی۔

”دیکھو نا۔ وہ بھی پاس ہوئی ہے۔ میں نے دیکھا۔ نہ ہی تم نے اُسے

مبارک دی۔ نہ ہی خالہ جان نے۔ اُس بیچاری کے دل پر کیا گزری ہو گی۔

”آپ جو ہیں مبارک دینے والے۔!“ بختمہ غصے میں ہوئی تو منصور ہلکے

رہ گئے۔ اُنھیں اُمید تھی کہ بختمہ سمجھانے سے سمجھ سکتی ہے۔ مگر وہ تو اُلٹا انھیں

طعنہ دے رہی تھی۔

وہ چپ سے ہو گئے۔ اور پھر خاموشی سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلے

گئے۔ اُن کے چہرے سے ظاہر تھا کہ اُنھیں اس بات پر رنج ہوا ہے اور

بختمہ اپنے کہے پر پچھتانے لگی۔

اُس وقت اُس کی ماں آگئی۔

منصور کہاں گئے۔

”اپنے کمرے میں۔!“ اُس کی آواز میں کچھ گھبراہٹ تھی۔

”کیوں خیر تبتہ۔“

”آماں۔ میں نے زیادتی کی۔

”کیا زیادتی۔“

بختمہ نے تمام قصصاں کو سُنا دیا۔ تو وہ بولیں۔

”تو بھی بھلی ہے۔ تیرے لئے وہ اخبار لے کر آیا۔ اسے اس لٹری کے ساتھ بھلا کیا واسطہ۔“

”منصور لاجواب سے ہو گئے۔“
”نجمتہ نے ڈھیر ساری باتیں کیں۔ وہ بھی بے دلی سے جواب دیتے رہے پھر وہ اٹھ کر چلی گئی۔“

کھانا کھا کر وہ سو گئے۔ اور سہ پہر کو اٹھ کر خاموشی سے باہر چلے گئے۔
تمو حیران ضرور تھی کہ آج منصور کو کیا ہوا ہے بلکہ آج تو اس کی زندگی کا ایسا دن تھا۔ جس میں وہ خوشی محسوس کر رہی تھی۔ اور منصور اس کا ساتھ نہ دے رہے تھے۔ وہ بڑی حیران تھی۔

عصر کی نماز پڑھ کر اس نے اپنی دادی اور ماں باپ کے لئے منفعت کا دعا کی۔ آج اس کا دل بے اختیار چاہنے لگا کہ وہ دادی اماں کی قبر پر جائے اور اسے یہ خوشخبری سنائے کہ دادی اماں۔ میں پاس ہو گئی ہوں۔ میں کامیاب ہو گئی ہوں۔ مجھے مبارک دینے والا کوئی نہیں۔ میں کسی کو نہیں سنا سکتی کہ میں کامیاب ہو گئی ہوں۔ اسی لئے آپ کے پاس آئی ہوں۔
وہ اٹھ کر چچی کے پاس آئی۔

”چچی۔“

”ہوں۔!“ وہ مشین پر کچھ سی رہی تھیں۔

”میں گلو کہ ساتھ لے کر قبرستان ہواؤں۔“ وہ ڈرتے ڈرتے بولی۔
”کیوں۔“

”نکر آتا۔ وہ اس کی ہمدردی تو کرتے ہیں تب ہی تو مجھے غصہ آ جاتا ہے!“
”وہ لوہی کہتے ہیں۔ مظلوم جو بنی رہتی ہے۔ اُن کے سامنے دیکھتی نہیں۔ کس طرح خاموش بن جاتی ہے۔!“
”تو اب کیا کروں۔“

”جا کر کہہ دو۔ کہ یونہی منہ منہ لک گیا تھا۔“
”اچھا جاتی ہوں۔!“ کہتے ہوئے نجمتہ منصور کے کمرے کی طرف چلی گئی۔
— وہ پتنگ پر لیٹے سکر بیٹ پی رہے تھے۔
”ناراض ہو گئے ہیں کیا۔“ نجمتہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

”اوہ۔ نجمتہ۔ نہیں تو۔!“
”پھر آپ کیوں اٹھ کر چلے آئے۔“

”یوں ہی۔!“

”میں سمجھی ناراض ہو گئے ہیں۔!“ نجمتہ ہنس پڑی۔
”نہیں نجمتہ۔ میں تو تمہیں سمجھا رہی تھی کہ رات کر رہا تھا۔ دیکھو نا۔ وہ کس قدر
مکھی سی ہے۔ کم از کم۔ تم۔“

”آپ اس کا نام میرے سامنے مٹ لیا کریں مجھے وہ اچھی نہیں لگتی۔
نجمتہ نے بات درمیان میں ہی ختم کر دی۔

”بس یونہی دل بہت پریشان ہے۔!“ اُس کی آواز بھڑکائی۔

جالے کیوں۔ رشیدہ کو رحم آگیا۔ اور بولی۔

”جلدی آجانا۔“

”اچھا چچی۔ وہ گلو کو ساتھ لے کر برقعہ پہن کر باہر نکل گئی۔

راستے میں اُس نے پھول خریدے۔ کچھ مٹی کے چراغ بھی لئے اور قبرستان کی طرف چل دی۔

جیسے ہی وہ ایک موڑ مڑنے لگی منصور نے اُسے اور گلو کو دیکھ لیا۔ وہ اُس وقت اپنے ایک دوست کے ساتھ تھے۔

”اُنھوں نے دیکھ لیا کہ مقبرستان کی طرف جا رہی ہے۔ لہذا وہ اپنے دوست کو روک چکر کرنے کی باتیں کرنے لگے۔

تمو نے قبرستان پہنچ کر اپنی دادی آماں اور اپنے ابو، امی کی قبروں پر پھول چڑھائے۔ چراغ جلائے۔ دعا پڑھی۔ دادی کی قبر پر دعا پڑھتے ہوئے اُس کے آنسو ٹپ ٹپ کرنے لگے۔

دادی آماں۔ میں پاس ہو گئی ہوں۔ میں آپ کو یہ خوش خبری سنانے آئی ہوں۔ خوش ہیں نا آپ۔“ وہ جذباتی تھی ہو گئی۔

اُسے پتہ بھی نہ چلا۔ منصور اُس کے پیچھے کھڑے تھے۔ گلو اُنھیں دیکھ چکا تھا۔

اور پھر منصور نے اپنے ہاتھ اُس کے کندھوں پر رکھ دیئے۔

وہ چونکا کر دیکھنے لگی۔ سامنے منصور تھے۔

”آپ۔؟“ اُس کی آنکھیں برس برس سی رہی تھیں۔

”ہاں۔ میں۔ وہ اُس کے قریب ہی بیٹھ گئے۔

اُن کی نگاہوں میں بے پناہ عقیدت تھی۔ بے انتہا پیار تھا۔

”آپ یہاں کیسے۔؟“ وہ آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔

”تمہیں اس طرف آتے دیکھ لیا تھا۔“

”میرا دل بڑا پریشان تھا آج۔ اگر میں یہاں نہ آتی۔ تو جانے کیا ہوتا۔!“

اُس کی آواز بھڑاسی گئی۔

”اچھا کیا تم نے۔ مگر تم پریشان کیوں تھیں۔؟“ منصور مسکرا کر بولے۔

جواب میں وہ رو دی۔ اور ان آنسوؤں نے تمام باتیں منصور کو سمجھا دیں۔

”گلو۔ یہ لو پیسے۔ وہ جو سامنے بابا بیٹھا ہے نا۔ اُسے دے آؤ۔!“ منصور

نے گلو کو پیسے دیئے۔ اور وہ چلا گیا۔

”میری دیوانی سی تم ہو۔!“ وہ اس کے آنسوؤں کو اپنی انگلیوں سے

مٹاتے ہوئے بولے۔

”منصور۔!“ اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

”جان منصور۔؟“ وہی پیارا انداز۔ وہی دالہانہ پن۔

”چلیے اب۔“ نمونے کہا۔

”چلیے جناب۔!“ منصور مسکرا کر اُس کے ساتھ ہو بیٹے،
اور وہ قبروں پر آخری نظریں ڈالتی ہوئی اُن کے ساتھ چل دی۔

”تمو۔“ منصور نے چلتے ہوئے پکارا۔

”چلو۔ کہیں گھوم آئیں۔“ آج تمہیں چھٹی ملی ہے۔!“

”نہیں۔ دیر ہو جائے گی۔ چچی خفا ہوں گی۔!“

”وہ تو ہوتی ہی رہتی ہیں۔!“

”دیر ہو جائے گی۔!“

”چلو۔ پھر چائے پی لیتے ہیں۔“

منصور نے ٹیکسی روکی۔ اور پلس (PALAS) چلنے کو کہا۔ کچھ

ی دیر میں وہ پلس پہنچ چکے تھے۔

تمو ڈر رہی تھی۔ گلو کو منصور نے مال کی ایک میز پر بٹھا دیا۔ اور

چائے منگوا کر دی۔ اور خود تمو کے ساتھ کین میں آگئے۔

”مجھے ڈر لگ رہا ہے۔!“ تمو نے کہا۔

”کیوں؟“ منصور کی نظروں میں بے پناہ عقیدت تھی۔

”وہ۔ چچی خفا ہوں گی نا۔!“ الفاظ نظروں کی تاب نہ لا کر ڈمک گئے۔

منصور نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور انکلیوں کو جویم کر بولے۔

”میں گھٹ گھٹ کر مر جاؤں گی۔!“ میں بھی تمہارے ساتھ ہوں گا۔

”اُٹھ نہ کرے۔!“ اُس نے جلدی سے اپنا ہاتھ اُن کے منہ پر رکھا۔

”چلو۔ چلیں۔“

”چلیے۔!“

”مگر ٹھہرو۔ میں دادی آماں سے کہہ تو دوں۔ کہ تم میری ہو گئی ہے!“

وہ آنسوؤں کے درمیان مہنس دی۔

”دادی آماں۔ تم میری ہی ہے۔ آپ گواہ رہیے گا۔ میں اسی کے لئے

مردوں گا۔ اسی کے لئے جیوں گا۔ اور جب ہم دونوں کامیاب ہو جائیں گے

تو میں تم کو ساتھ لے کر یہاں آؤں گا۔ آپ کی قبر پر چراغ چلاؤں گا۔ اُس وقت

دادی آماں۔ تم خوب سچی سچی ہو گی۔ اُس نے نہایت خوبصورت کپڑے پہنے

ہوں گے۔ پھولوں کا گہنا پہنا ہو گا۔ یہ دُہن ہو گی دادی آماں میری دُہن

تب یہ شرماتی ہوئی ہاتھ اٹھائے گی۔ دعا کرے گی کہ کہ منصور ضررِ نظر سے

تم کو گھور کر کچھ اور کہنے والے نکلے کہ تم نے شرماکر اپنا ہاتھ اُن کے ہونٹوں پر رکھا۔

”اؤں ہوں۔ بڑھکونی نہ کرو۔“ پوری بات تو دادی آماں کو بتا لینے دو؟

”بیٹے بھی اب۔“ آپ بڑے ہی۔“ شرم سے اُس کے چہرے پر شفق سی پڑ

رہی تھی۔

گلو آہستہ آہستہ آ رہا تھا۔

”جلد ہی یہ مجبوریاں ختم ہو جائیں گی۔!“

وہ شرم سے گڑھی جا رہی تھی۔

بیر منصور کے آڈپر چائے اور پیٹری، کیک وغیرہ لے آیا۔

دونوں چائے بھی پیتے رہے۔ اور باتیں بھی ہو رہی تھیں۔

”اب چلے۔ دیر ہو گئی۔“

”چلتے ہیں۔ آج تم منصور کو بہت اچھی لگ رہی تھی۔ یوں تو ہر وقت ہی اچھی لگتی تھی۔ مگر آج اس کے چہرے پر ایک عجیب سا تقدس تھا۔“

”تمو۔“ ”جی۔!“

تمہاری کامیابی کا ایک تحفہ لایا ہوں۔ قبول کرو۔“ ”اُمحوں نے جیب سے ایک کیس نکال کر میز پر رکھ دیا۔

وہ صرف نظریں اٹھا کر رہ گئی۔

”میری تمو۔ بھلا تمہاری کامیابی کی مجھ سے زیادہ کسے خوشی ہو سکتی ہے؟“

— میں تو اتنا خوش ہوں کہ۔ کہ۔!“

”ہیٹے۔ اب چلے۔“ ”اُس کی آواز بے حد بوجھل تھی۔

”یہ تحفہ تو دیکھ لو۔“

اُس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے کیس کھولا۔ ایک نہایت خوبصورت گھڑی جگمگا رہی تھی۔ ”شکریہ۔!“ وہ مسکرا کر بولی۔ ”شکریہ کے لئے شکریہ۔!“

بیر ابل لے آیا۔ منصور نے بل ادا کیا۔ اور وہ دونوں باہر نکل آئے۔

سور نے گٹو اور تمو کو تانگہ لے دیا۔ اور خود وہیں کھڑے جالتے تانگے کو دیکھتے رہے۔

تمو کو یوں لگ رہا تھا۔ جیسے جلتے ہوئے انگاروں پر کسی نے پانی کی ٹی انڈیل دی ہے۔ اُس کی بے قرار یوں کو جانے کیوں کچھ چین سا لگیا تھا۔

”تانگہ کلی کے سامنے رکا۔ تو تمو کو کلو کا خیال آیا۔“

”گٹو۔“

”جی۔ بی بی جی۔!“

”وہ۔ گھر میں کسی سے مت کہنا۔ کہ ہمیں منصور ملے تھے۔“

”میں جانتا ہوں۔ بی بی جی۔“

وہ دونوں گھر میں داخل ہوئے۔ تو چچی تخت پوش پر بیٹھی تھیں۔

”بڑی دیر کر دی تم نے۔“ ”وہ ماتھے پر ہل لاتے ہوئے بولیں۔

وہ کچھ نہ بولی۔ اور اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔

گٹو باورچی خانے میں جا کر ماما کے ساتھ کام کرنے لگا۔

اور تمو رسٹ وایج کو دیکھ کر شرماسی گئی۔ اور پھر اپنے کس میں کھ

کر رہا ہر نکل آئی۔

”تمو۔ جانے مجھے کیا ہو رہا ہے!“ منصور کی آنکھوں سے حقیقت نکلتی تھی۔

”کیا۔؟“ اُس کی آنکھوں میں سُرخ سی آگئی۔

”سوچتا ہوں۔ اتنی جان کے پاس جا کر وقت کیوں کر گزرے گا؟“ اُس نے سُرخ جھکا لیا۔ اور مرچیں تیز تیز کاٹنے لگی۔ ریڈیو پر اب کوئی اور گانا نہ لگا تھا۔

”نہ گنواؤ نادک ٹیم کش دلِ ریزہ ریزہ گنوا دیا“ سن رہے ہیں آپ۔؟“ تمو بولی۔

”بہت اچھی چیز ہے۔!“

”تمو۔ آج میرے پاس ایک مریض آیا۔“

”تو پھر۔؟“

”وہ بولی۔“

”وہ کسی اور زبان کا تھا۔ مگر جب وہ اپنی بولی بولتا تو مجھے بڑا اچھا لگتا۔“

”پھر۔؟“

”اُس نے مجھے کہا۔“

”ڈاکٹر۔ دوائی دینا۔؟“

(۳۳)

”نجمہ نے سہیلیوں کی پارٹی کی تھی۔ آج وہ بے حد مصروف تھی۔ تم کو بھی صبح سے کام میں مشغول تھی۔“

”اُس کے سپرد سمو سے، شامی کباب اور پکوڑے وغیرہ بناتے تھے۔“

”لہذا وہ صبح سے مصالحوں وغیرہ ملا کر آٹا تیار کرتی رہی۔ کہیں قہیلہ و ڈال پس جا رہی تھی۔ وہ باورچی خانے میں بیٹھی مرچیں کتر رہی تھی۔ منصور آکر دروازے پر کھڑے ہو گئے۔“

”باہر نجمہ نے ریڈیو زور سے لگایا ہوا تھا۔ لتا کا رہی تھی۔“

”لگ جا گئے ابھی کہیں رات ہو نہ ہو“

”شاید میری تیری کبھی بات ہو نہ ہو“

”گانا سن رہی ہو۔؟“ اُنھوں نے کہا۔

”ہوں۔!“ وہ مسکرائی۔

”کیسا ہے۔؟“

”بہت اچھا۔!“

”وش۔ ۹۔“ نمونے حیرت سے پوچھا۔

”ہوں۔ جانتی ہوں۔ وش کا مطلب کیا ہے۔ ۹۔“

”نہیں تو۔!“ اُس نے مصمصیت سے سر ہلا دیا۔

”وش کا مطلب ہے۔ سیٹھا۔“

”یعنی اُس نے کہا۔ کہ دوائی سیٹھی دینا۔ نمونہ س کر بولی۔“

”ہاں۔ اور جانتی ہو۔ میں تمہیں کیوں بتا رہا ہوں۔ ۹۔“

”بتائیے۔ ۹۔“

”وش مجھے بڑا پیارا لگا۔ میں نے سوچا کہ میں اپنی نمونے جا کر کہوں گا کہ تم وش ہو۔ تمہاری باتیں وش ہیں۔ تمہیں پاکر میری زندگی وش ہو جائے وہ کھوئی کھوئی سی سُستی رہی۔ کیا واقعی اُسے پاکر زندگی وش (مٹھی) ہو سکتی ہے۔“

دُور سخمہ نے گلو کو آواز دی۔ تو منصور مسکرا کر چلے گئے۔

شام ہونے سے پہلے ہی سخمہ تیار ہو کر بیٹھ گئی۔

تیز گلابی سوٹ اور اسی رنگ کا دوپٹہ جس کے کناروں پر کرن لگی ہوئی تھی اُسے اچھا ہی لگ رہا تھا۔

”تم کبھی کپڑے بدل لو۔ ۹۔“ رشیدہ نمونے کے قریب آکر بولیں۔“

جی۔ میں بھی۔ ۹۔

”ہاں ہاں۔ بدل لو جا کر۔“

وہ حیرت اور مُسترت میں اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اُسے ناہید سے

معلوم ہو چکا تھا کہ منصور کو ہلکا نیلا رنگ بید پسند ہے۔ تب اُس نے

نیلے رنگ کی کمریپ کا سوٹ فیکا لا۔ جو اُس کی دادی نے مرنے سے چند

دن پہلے بنوا کر دیا تھا۔ اسی کا ہم رنگ دوپٹہ تھا۔

زندگی میں پہلی مرتبہ اُس کے دل میں بننے سنورنے کی خواہش پیدا

ہوئی۔ تب اُس نے بڑے اہتمام سے اپنے آپ کو ستورا۔ ہلکے سے

میک اپ میں وہ بے حد حسین لگ رہی تھی۔

جب وہ باہر نکلی۔ تو سب سے پہلے اُسے منصور نے جو چنبیلی کی

بیل کے پاس کھڑے تھے۔

انھوں نے گھور کر دیکھا۔ تو وہ شرمائی۔

”ماشاء اللہ بڑی۔“

انگلے ہی لمحے نمونے اپنے منہ پر انگلی رکھ کر چپ رہنے کا اشارہ کر دیا۔

رشیدہ بیگم اُسے دیکھ کر حُل ہی تو لگی اور اچھے پر ہاتھ رکھ کر بولیں۔

اے۔ کوئی شادی ہے۔ ۹۔ میں نے تو یاد نہی دھلے ہوئے کپڑے

پہننے کو کہا تھا۔

سخمہ بھی اس طرف آگئی۔ نمونہ کو دیکھ کر وہ بڑی طرح حُل لگی۔ اور اُس پر

طرہ یہ کہ منصور بھی پاس کھڑے اُسے دیکھ رہے تھے۔

وہ رہ نہ سکی۔ تو بولی۔

”آاں۔ یہ تو کپڑے پہن کر بیٹھ گئی۔ چائے وغیرہ کون بنائے گا؟“ وہ اما جاہل کیا بنائے گی۔

”تو میں کیا جتنا بہ کی تو کرانی ہوں۔“ تم کو کو بہت بُرا لگا۔ اُس نے غصے میں کہہ دیا۔

”دیکھ لیا آاں۔“ میں نے کون سی خراب بات کی ہے جو یہ مجھ سے لڑنے لگی ہیں۔“

”ہائے ہائے۔ اپنی حیثیت تو دیکھ۔ پھر بات کرنا۔ رشیدہ فوراً تیز ہو گئیں۔ منصور بہت حیران ہوئے۔ انھیں سنجہ اور رشیدہ پر بہت غصہ آیا۔ اور وہ آگے آکر بولے۔

”خالہ جان۔ حوج کیا ہے۔ اگر تمہو نے کپڑے پہن لیے۔ پارٹی ہے۔ اس میں جھکڑے کی کیا بات ہے؟“

سنجہ رونے لگی۔ تو رشیدہ کا پارہ اور تیز ہو گیا۔

خدا اس منحوس کو جلد اٹھالے۔ میری تو ایک ہی بیٹی ہے۔ اُسے رُلا رلا کر مار دے گی یہ۔“

خالہ جان۔ آپ زیادتی کر رہی ہیں۔ منصور بڑی مشکل سے اپنا غصہ ضبط

کر رہے تھے۔

تمہو وہیں کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ اُس کے کان سائیں سائیں کر رہے تھے۔ اور جسم جیسے منجمد ہو کر رہ گیا تھا۔

سنجہ رد رہی تھی۔ اور رشیدہ تم کو کو سنے دے رہی تھی۔ تب وہ بھاگ کر اپنے کمرے میں چلی آئی اور پلنگ پر گر پڑی۔ باہر منصور غصے میں بھرے کھڑے تھے۔ رشیدہ سیکم چا پوسی کرتے ہوئے کہنے لگیں۔

”بیٹھو بیٹیا۔ تم کیوں خواہ مخواہ اپنا جی خراب کرتے ہو۔“ چپ ہو جاؤ سنجہ۔“ دیکھو منصور پریشان ہو رہے ہیں؟

اور منصور ہلکے بکے رہ گئے۔ انھیں رشیدہ سے نفرت ہو گئی۔ انھوں نے اُسی لمحے فیصلہ کر لیا کہ فوراً ہی والدہ کے پاس جائیں گے اور تم کو کو اس غذا سے جلد چھڑوائیں گے۔

”جاؤ۔ میری بیٹی۔ منہ دھو لو۔ روئیں تمہارے دشمن۔ آنے دو تمہارے آبا کو انتظام کرو اتنی ہوں اس کا بھی۔ رشیدہ بیٹی کو چپکار تے ہو تو بولی۔

وہ آنسو پونچھتی ہوئی ایک طرف چلی گئی۔

تمہو نے پھر وہی پُرانے ملگجے سے کپڑے پہن لیے۔ وہ کپڑے رکھے ہوئے اُس کا دل خون ہو گیا۔ رکتے ارمانوں۔ رکتی آرزوؤں سے کپڑے پہنے تھے۔

— مگر۔ وہ کچھ سوچ نہ سکی۔ اور آنسو ٹپ ٹپ کرنے لگے۔ جب وہ

باہر لگی تو منصور نے اُس کی طرف بڑے درد سے دیکھا۔ وہ سر جھٹکا کر
بادرچی خانے کی طرف چلی گئی منصور کے دل پر ایک ٹھیس سی لگی۔
سنجہ کی سہیلیاں آنے لگیں۔ وہ دہاں چلی گئی۔ اور رشیدہ اندر بیٹھیں
میں پیٹری وغیرہ لگانے لگی۔

منصور بادرچی خانے کے دروازے پر آئے۔ تو اُنہوں نے دیکھا۔
تمو، صبر و ضبط کی تصویر بنی کیتلیاں صاف کر رہی ہے۔
”تمو۔ ۹“ اُن کی آواز بھڑکی ہوئی تھی۔
وہ صرف نگاہیں اٹھا کر رہ گئی۔ ایسی نگاہیں جن میں بے پناہ مایوسی تھی
منصور ٹپ کر بولے۔

”غیم نہ کرو۔ میں بہت جلد تمہیں اس عذاب سے چھڑا دوں گا۔
اور ہاں۔ میں نے جو تمہیں دیکھ لیا۔ تم بڑی پیاری لگ رہی تھیں۔
تب وہ رو پڑی۔

”خدا کے لئے چپ ہو جاؤ۔ ورنہ میں سب قید آج ہی توڑ دوں گا۔ ۹“
”نہیں۔ نہیں۔ کیسا نہ کیجیے۔“

وہ واپس اپنے کمرے میں چلے گئے۔

ڈرائنگ روم میں سنجہ کی سہیلیوں کے قہقہے گونج رہے تھے۔
تمو چائے بنانا کر بھجواتی رہی۔

سنجہ اور رشیدہ نے خود ہی میز سیٹ کر لی۔
اور پھر خوب دھما چوڑی مچی رہی۔
لڑکیاں گاتی رہیں۔

ناچتی رہیں۔

تمو براہِ آمدے میں چینیلی کے پاس کھڑی سوکھے پتے فوجیتی رہی۔
وہ پتے جن کی مانند وہ خود بھی تھی۔

”ایک سوکھا پتا“

منصور باہر چلے گئے تھے۔

سنجہ کی سہیلیاں اُس پر ہنسی ہوئی گئیں۔

تو تمو اپنے کمرے میں آکر لیٹ گئی۔

کتنی بد نصیب ہوں۔

کتنی حرام نصیب۔

تب اسے ہنسی آگئی۔

شائد اپنی حرام نصیبی پر۔

جب منصور باہر نکلے تو رشیدہ اور نجمہ کی تیز نظریں اُس کا تعاقب کر رہی تھیں۔ وہ سیدھا خالہ کے پاس آئے۔

”میں جا رہا ہوں۔ خالہ۔“

”کب تک آؤ گے بیٹا۔“

”یہی۔ چار دن بعد۔!“

”اچھا جاؤ۔ خیر کے ساتھ اپنی آٹاں کو بہت بہت سلام دینا۔ اور

ناہید کو بے حد پیار دینا۔“

”نجمہ۔ تم کوئی پیغام نہیں دے رہی ہو۔ ناہید کے لئے۔“

منصور مسکرائے۔

آپ کے پاس پہلے ہی پیغام زیادہ ہو گئے ہیں۔ مجھ بے چاری کا کہاں

منجالیں گے۔“

نجمہ طنز یہ بولی۔

”اچھا تو۔ خدا حافظ۔!“ منصور ہنس کر بولے۔

”خدا حافظ۔!“

”گلو ان کا اٹیچی کیس باہر لے گیا۔ اور وہ بھی سلام کر کے چلے گئے۔ اُن کے

جانے کے بعد رشیدہ لا زدا رانہ لہجے میں بولی ”ہائے ہائے۔ میں تو پہلے ہی

روتی تھی۔ کہ یہ کمبخت ضرور کچھ گل کھلائے گی۔“

(۳۴)

دوسری صبح وہ ناہید کے آئے ہوئے خط کا جواب لکھ رہی تھی کہ منصور آ گئے۔

”میں جا رہا ہوں۔ تم۔“ وہ مسکرا کر کہنے لگے۔

”جی۔“ وہ چونک سی گئی۔

”ہاں میں آج امتی کے پاس جا رہا ہوں۔ میں اُن سے سب کچھ کہہ دوں گا۔“

”سوچ لیجئے۔ کہیں۔“

”تم اب مایوسی کی باتیں نہ کرو۔ میں سب کچھ کر لوں گا۔“

”وہ سنس دی۔ مگر ایسی ہنسی جس میں خوف زیادہ تھا۔“ دعا کرنا۔“

منصور اس کے تڑپ چپٹ لگا کر بولے۔

وہ صرف مسکرا دی۔

”اچھا خدا حافظ۔!“ اُن کی نظروں میں وہی عقیدت تھی۔ ”خدا

حافظ۔“ لفظ تمہ کے لبوں پر کانپ رہے تھے۔

کوئی رشتہ دیکھتے تو ہی کا۔ اور تمہارے آبا سے بھی بات کرتی ہوں۔!“
 ”دیکھا کتنی ذلیل ہے۔ جس تھالی میں کھایا اسی میں چھید کر دیا۔“
 ”اُس ڈھلڑکی ترمیت تھی نا۔!“ رشیدہ فوراً بولی۔
 ”میں تو کُوب سے تماشہ دیکھ رہی ہوں۔!“ نجمہ نے کہا۔
 ”اچھا۔ تم خط لکھو۔ کل تک پہنچ جائے گا۔“ رشیدہ نے کہا۔
 نجمہ اندر سے پیڑ، پین اور لٹافہ اٹھا لائی اور خط لکھنے لگی۔
 رشیدہ بھی باتیں بنا رہی تھی۔ ساتھ ساتھ۔
 خط لکھ کر اُس نے ماں کو سنایا۔ لکھا تھا:-
 پیاری آیا جان۔!
 آداب۔!

امید ہے آپ خیریت سے ہوں گی۔ آج ہی منصور میاں روانہ ہو گئے۔
 آیا جان۔ بات تو کہنے کی نہیں۔ مگر آپ کو آگاہ کرنا بھی تو ضروری ہے۔ تمہو
 منصور میاں پر کچھ ایسا جادو کر دیا ہے۔ کہ کیا بتاؤں۔ نجمہ سوکھ کر کاٹ
 ہوئی جا رہی ہے۔ شاید منصور میاں اسی سلسلے میں آپ کے پاس آئے
 آیا۔ نجمہ میری اکلوتی اولاد ہے۔ منصور سے وہ بچپن سے ہی منسوب
 ہے۔ اگر خدا نخواستہ میری نجمہ کو کچھ ہو گیا۔ تو میرے لئے دُنیا اندھیر
 جائے گی۔ اب میری اور نجمہ کی زندگی آپ کے ہاتھ میں ہے۔

”میں نے آپ کو پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ منصور بہت دلچسپی لے رہے ہیں۔
 مگر آپ مانتی ہی نہیں تھیں۔“ نجمہ تیز ہو کر کہنے لگی۔
 بھلا میں سادہ خصلت بھلا ان چکروں کو کیا جانوں۔ ہائے میں تو
 آستین میں سانپ پال رہی تھی۔ مجھے کیا معلوم تھا۔
 ”مجھے تو یوں لگتا ہے۔ جیسے منصور کا جانا بھی کسی مقصد کے لئے ہے؟
 نجمہ سوچ کر بولی!“

”کسا مقصد ہو سکتا ہے بھلا۔“
 ”کچھ نہ کچھ تو ہو گا۔“
 ”یہ نہیں ہو سکتا۔ وہاں بھی آپا ہیں۔ کوئی اور نہیں؟“
 ”آپ ایک خط لکھ دیں خالہ کو۔“
 ”خط۔“ رشیدہ سوچتے ہوئے بولی۔
 ”ہاں۔ ممکن ہے منصور کا کوئی وار ہی چل جائے۔ احنیا طاہی سہی۔“
 ”اچھا تو لکھ ہی دیتی ہوں۔ تم ہی لکھو میری طرف سے؟“
 ”ویسے بیٹن لولہ لکی۔ دُنیا ادھر کی ادھر ہو جائے۔ مگر اس تم کو تو
 نرا چکھا کر رہوں گی۔“

”اس کو دفع کیوں نہیں کرتیں آپ؟“ نجمہ نے کہا۔
 ”ہاں۔ آج گلو کے ہاتھ فیروزہ لہو کو بھیجوں گی۔ اور کہوں گی کہ کہیں

زیادہ خیریت - ناہید کو پیار - فقط - تمہاری

”رشیدہ“

نجمہ نے لفافہ بند کر کے گلو کو آواز دی - وہ منصور کو ٹیکسی پر بٹھا کر
اچکا تھا۔

گلو - یہ لفافہ پوسٹ کر آؤ۔

”گلو - یہ بھی لے جانا۔“ تم نے برآمدے سے آواز دی۔

”کسے لکھا ہے۔“ رشیدہ دانت پس کر بولی۔

”ناہید کو۔“ تم نے جواب دیا۔

”کیوں۔“ ناہید تمہاری کیا لگتی ہے؟ لکھے نہ لکھے - نجمہ - تم کون ہوتی

ہو۔ اب اُن پر بھی ڈور سے ڈال رہی ہو۔

تمو کی بکی رہ گئی - رشیدہ نے گلو کے ہاتھ سے لفافہ چھین کر ٹکڑے
ٹکڑے کر دیا۔

تمو وہیں کھڑی کھڑی رہ گئی۔

”جاؤ۔ منہ کیا دیکھ رہے ہو۔“ نجمہ نے گلو کو ڈانٹا۔

وہ سر جھکا کر باہر نکل گیا۔

نجمہ شرم نہ آئی کم بخت - رشیدہ چیخی۔

”کیا کیا ہے میں نے۔“ تمو بولی۔

”راتنے میں شفیق الرحمن اندر آ گئے۔

”کیا ہو رہا ہے۔“ انھوں نے پوچھا۔

”پوچھو۔ اپنی چہیتی سے۔! رشیدہ بل کھاتی ہوئی ناگن کی طرح تڑپی۔“

”کیا ہوا ہے نمو۔“ انھوں نے پیار سے پوچھا۔

”مجھے تو کچھ معلوم نہیں۔ چچا جان۔! وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

”تم بڑی بھولی ہو نا۔! میں تو پہلے ہی کہتی تھی۔ یہ آستین میں سانپ ہے۔“

”مگر تمہو کیا۔“ شفیق الرحمن غصے میں بولے۔

”مخترمہ۔ منصور میاں پر اس لگائے بیٹھی ہے۔ جانے اُسے

کیا پتی پڑھائی ہے اس نے۔“

”خواہ مخواہ الزام مت لگایا کرو۔“ شفیق الرحمن غصے میں چیخے۔

”تو کیا میں جھوٹ بول رہی ہوں؟ رشیدہ اور بھی تیز ہو گئی۔

”ہاں۔ بالکل جھوٹ۔“ تمو کھڑی کھڑی کانپ گئی۔

”روز روز کی جھک جھک سے تنگ آ گیا ہوں۔“ انھوں نے تمو سے کہا۔

وہ چپ چاپ اپنے کمرے میں چلی گئی۔

تو رشیدہ نے پالیسی سے سب باتیں شفیق الرحمن سے کہہ دیں مگر انھیں

یقین پھر بھی نہ آیا۔ لیکن پھر بھی انھوں نے سوتھ لیا کہ اب تمو کی جلد از

جلد کہیں شادی کرونی چاہیے۔ کیونکہ گزارہ مشکل ہو گیا تھا۔

”میں نے آج فیروزہ بلاؤ لایا ہے۔ کہ اس کلمہ ہی کے لئے کوئی رشتہ دیکھے۔ اور دیکھیجی۔ اس کو جلدی ہی چلتا کرو۔“

رشیدہ نے کہا۔

”ہاں ہاں۔ ایسا ہی کر دوں گا۔ رشتہ بھی تو اچھا ملے“

”رہ جائے گا۔ میں آج ہی اُسے کہتی ہوں کہ جلد از جلد کوئی رشتہ ڈھونڈ لے؟“
باہر کھڑی سی پاک رہی تھی۔

اور اندر تو منصور کی کامیابی کی دُعا مانگ رہی تھی۔ اُسے بڑا یقین تھا

کہ فہمیدہ بیگم مان جائیں گی۔ ضرور مان جائیں گی۔

اور پھر وہ اس جہنم سے چھوٹ جائے گی۔

منصور کے ساتھ اُس کی زندگی حسین گزرے گی۔ یہ دکھ اُسے یاد بھی نہ

آئیں گے۔ منصور۔ اللہ تمہیں کامیاب واپس لائے۔

(۳۵)

منصور کو گھر پہنچے دوسرا دن تھا۔ مگر انھوں نے ابھی تک بات نہ کی تھی۔
آج اُن کا پکا ارادہ تھا بات کرنے کا۔ اور اس دوران رشیدہ کا خط
بھی پہنچ چکا تھا۔ خط پڑھ کر وہ عجب پریشانی میں پھنس کر منصور آگئے اور
کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولے۔

”آناں۔ آپ سے کچھ باتیں کرنا ہیں“

فہمیدہ بیگم کا ماتھا ٹھنکا۔

”کیا بات ہے بیٹا۔“ اور پھر خود ہی بولیں۔

”بیٹا۔ اب میں بھی چاہتی ہوں کہ تمہاری شادی ہو جائے۔ سچہ اس گھر میں
آجائے گی۔ تو میری بھی اُداسی دُور ہو جائے گی۔ اب تم سے دُور نہیں رہا جاتا۔
تم بھی اپنی ٹرانسفر کروالو۔

ہاں آتی۔ ٹرانسفر تو میں کرالوں گا۔ اور آپ کی اُداسی بھی دُور ہو جائے گی۔
مگر۔ وہ کہتے کہتے ڈک گئے۔

”مگر کیا۔“

گھر۔ اُمّی جان۔ اس گھر میں سچے نہیں آئے گی۔ مجھے وہ بالکل بھی پسند نہیں۔ میرے خیال کچھ ہیں۔ اُس کے خیال اور ہیں۔ میری اور اس کی زندگی اچھی نہ گزر سکے گی۔

”کیسی باتیں کر رہے ہو بیٹا۔“ فہمیدہ بیگم کے ذہن میں رشیدہ کے خط کے الفاظ ناچنے سے لگے۔

”ہاں اُمّی۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ آپ خالہ جان کو لکھ دیجیے۔“
 ”بیٹا۔ یہ بھلا کیسے ہو سکتا ہے۔“ سچے سچے چہرے میں منسوب ہو چکی ہے۔
 ”تو کیا ہوا اُمّی جان۔ ذرا سی بھول کے لئے میں اتنی بڑی غلطی نہیں کر سکتا؟“
 ”منصور۔ تم یہ بھی جانتے ہو کہ سچے میری بہن کی بیٹی ہے۔ اور میری ایک ہی بہن ہے۔ اس رشتے کے منسوخ ہونے سے وہ بھی مجھ سے چھین جائے گی۔ اُمّی۔ منصور! منصور! جواب سے ہو گئے۔

”یہ فیصلے جذباتی ہیں بیٹے۔ سچے میں کوئی بُرائی نہیں۔ بیاہ ہو جانے دو، سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”مگر اُمّی۔ یہ میری زندگی کا سوال ہے۔ میں سچے سے شادی نہیں کر سکتا۔!“
 منصور کے سامنے تو کی معصوم صورت اُلٹی۔ ”مگر۔ کیوں۔“

”اس لئے کہ میں اُسے خوش نہیں رکھ سکوں گا۔!“

”تو پھر تم کسے خوش رکھ سکو گے۔“

”جس کے خیالات مجھ سے ملتے ہوں گے۔“

”کون ہے وہ۔“

”کوئی بھی ہو۔ مگر۔“

”میں جانتی ہوں۔ مجھے نہیں معلوم تھا۔ کہ انہی معصوم صورت کے سچے بہن ملی ناگن کھڑی ہے۔!“

”کیا اُمّی جان۔“ منصور چونکے۔

”تم تم سے شادی کرنا چاہتے ہو نا۔“ فہمیدہ بیگم غصے میں بولیں۔
 منصور کا سر آپ ہی آپ جھک گیا۔

”بولو نا۔ جواب دو۔ کیا تم تم سے شادی کرنا چاہتے ہو۔“

”وہ بڑی اچھی لڑکی ہے اُمّی۔ بڑی دکھی ہے۔“

”یہ میری بات کا جواب نہیں۔“

”آپ سوچئے تو سہی۔ اُمّی خدا کے لئے۔“

”مجھے جواب ہاں یا نہ میں چاہیئے۔!“ فہمیدہ بیگم زور سے بولیں۔

”ہاں اُمّی۔ تم کو میں نے اچھی طرح جان لیا ہے۔ وہ بڑی اچھی لڑکی ہے۔

”ہم سب کی زندگی۔“

گھر میں نحوست بھر دے گی۔ فہمیدہ بیگم بات کاٹ کر درمیان میں بولیں۔

”اُمّی۔ منصور زور سے چیخے۔“

کے سامنے آرہی تھی۔ آہ۔ تمہو۔ میں کیا کروں۔ میں کتنا مجبور ہوں۔
 تم کیا جانو۔
 ٹرین چل رہی تھی۔ اور منصور کم سُم سے بیٹھے سوچ رہے تھے۔ اب
 کیا ہوگا۔ اب کیا ہوگا۔

”سن لو منصور! یہاں ساری عمر نہیں ہو سکتا۔ اگر تم نے تمہو سے شادی کی
 تو ہماری شکل نہ دیکھ سکو گے جس دن میں نے سنا۔ میں تو ہر کھالوں کی پھر تم
 بے شک جو مرضی کر لینا۔“
 ”آئی۔“ منصور کا نب گئے۔

”تم جانتے ہو۔ تمہاری ماں کا فیصلہ کتنا اٹل ہوتا ہے۔“
 ”نہا کے لئے آئی سوچئے۔“ میری زندگی کا سوال ہے!“
 ”سب ٹھیک ہے۔ مگر میرا فیصلہ بھی اٹل ہے۔“

”امی۔“ منصور نے ماں کے پاؤں پکڑ لئے۔
 ”میں فیصلہ کر چکی ہوں۔ اب اس میں کوئی گنجائش نہیں۔“

منصور گر گر کر اٹھے۔ تڑپے۔ اپنی جان کی قسمیں دیں۔ مگر نرم دل والی تھیں۔
 پتھر بن گئیں۔ ان پر کچھ اثر نہ ہوا۔

ناہید بھائی کو دیکھ کر تڑپ اٹھی۔ اس نے ماں کو سمجھایا۔
 مگر ماں نے اسے بھی ڈانٹ دیا۔

اور پھر منصور بارے ہوئے جواری کی طرح اُسی روز واپس ہو گئے۔
 انھیں پتہ تھا کہ ان کی ماں کس طرح کی عورت ہے۔ وہ جو کہتی ہیں۔ ہر
 صورت میں پورا کر کے چھوڑتی ہیں۔

وہ بے حد پریشان تھے۔ بار بار تمہو کی لمبے معصوم صورت نظروں

بجھ منصور کا ہاتھ تھام کر لے گئی۔ منصور نے صرف ایک نگاہ نمود کی
ت دیکھا جو بڑی حسرت سے دیکھ رہی تھی۔ وہ ٹپ سے گئے۔
بجھ منصور کو بستر پر لٹا کر اس کا سر دبا لے گی۔
رشیہ چائے لے گئی۔ اور پھر دیر تک چائے پی کر باتیں کرتے ہوئے
ہر نکل گئی۔

(۳۶)

منصور جب گھر پہنچے تو شام ہو چکی تھی۔ رشیہ اسے دیکھنے ہی چلا گیا
آگے بیٹا۔ اتنی جلدی؟
”ماں خالہ جان۔ جلدی ہی آگیا ہوں۔“ ان کی آواز یوں لگتی تھی
جیسے بہت دور سے پیدل چل کر آ رہے ہوں۔
”طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔“ وہ ماتھا چھو کر بولیں۔
”طبیعت کچھ بوجھل سی ہے۔“
”ارے تمہیں تو بخار ہے۔ چلو اپنے کمرے میں۔“ میں چائے بنا کر لاتی
ہوں۔ رشیہ بولیں۔

نمود بڑی بے چین تھی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ منصور ناکام لوٹے ہیں۔
ہری مجبوراً ہی منصور سے رہتے۔ اور وہ انھیں پوچھ بھی نہ سکتی تھی۔ وہیں
ٹھہری کھڑی منصور کے کمرے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اور پھر اسے رشیہ کا
علم مل گیا۔
”منصور کے لئے تھوڑے سے چاول پکا لو۔“
”وہ جلدی سے بھاگی۔“ منصور کے لئے چاول۔ یہی بہت ہے۔

نمود بھی اپنے کمرے سے باہر نکل آئی۔ اور بجھ بھی آگئی۔
”خالہ جان اور ناہید کیسی تھیں۔“ بجھ نے آتے ہی سوال کر دیا۔
”اچھی تھیں۔“
”چلو بیٹا اپنے کمرے میں۔ آنکھیں تو دیکھو کیسی سرخ ہو رہی ہیں۔ بجھ
چلو لے چلو منصور کو۔“

آخر کو تو وہ اسی کا کام کر رہی ہے۔
وہ بڑی عقیدت سے چاول چھنے لگی۔
بجھ ماں کے پاس آکر بولی۔
”آپ نے اندازہ لگایا۔“
”ہاں۔ میں نے تمہیں پہلے ہی کہا تھا کہ دنیا ادھر کی اُدھر ہو جائے
آپا کبھی بھی ایسا نہ ہونے دیں گی۔!“

نجمہ شرماسی گئی اور رشیدہ اپنی فتح پر خوش ہو گئی۔

شفیق الرحمن اپنے کمرے میں بیٹھ کچھ پڑھ رہے تھے۔ رشیدہ اور

نجمہ دونوں وہیں آ گئیں۔

”میں نے کہا۔ منصور آگئے ہیں۔ رشیدہ بولیں۔

”اچھا۔ ابھی آئے ہیں کیا۔“ شفیق الرحمن ایک طرف رکھ کر مخاطباً

ہاں۔ بخار پڑھا ہوا ہے۔“

”تو پھر۔“

”چائے پی کر بیٹھے ہیں ابھی۔“

”میں جاؤں پوچھنے۔“

”بھڑ۔ ابھی۔ کچھ باتیں کرتا ہیں۔“

”وہ بڑا فیروزہ آئی تھیں۔“

کوئی رشتہ دیکھا اُس نے۔“

”ہاں کہہ رہی تھیں۔ کہ محمود کی ماں بڑی خواہش مند ہیں۔ محمود کے لئے؛

”کون سا محمود۔“

”اے وہی۔ سرفراز کا بیٹا۔“

وہ محمود۔ دنیا کا لچا لچکا۔ شرابی۔ شفیق الرحمن غصے سے بولے۔

”اے تو۔ اور کیا کلٹر کا رشتہ آئے گا۔ لوگ تو اس کی نحوست سے

رتے ہیں۔ فیروزہ بولا کہہ رہی تھیں۔ کہ جس جگہ کہا۔ لوگ یہی کہتے ہیں۔

ہن لڑکی منحوس ہے۔“

”رشیدہ۔! خدا سے ڈرو۔“ شفیق الرحمن بولے۔

”اے تو میں حضور اکبر رہی ہوں۔ دنیا کہتا ہے۔“

”انھیں کہہ دو کہ مجھے منظور نہیں۔ میں خود کہیں کوشش کروں گا۔

نجمہ آنکھیں کھٹاتی ہوئی باہر نکل گئی۔

ایک اور رشتہ کا بھی اُس نے بتایا ہے۔ رشیدہ پھر بولیں۔

”وہ کون سا ہے۔“ ہوگا کوئی بے تکا سا۔“

”تم تو ہر ایک میں عیب ہی نکالو گے۔ سن تو لو۔“

”سناؤ سناؤ۔! شفیق الرحمن مسکرا کر بولے۔

وہ فیروزہ بولا بتا رہی تھیں کہ حاجی صاحب بھی شادی کرنا چاہتے ہیں۔

”حاجی صاحب۔ کون سے حاجی صاحب۔“

”اے وہی حاجی عبدالقصد۔“

”لا حول ولا قوتہ۔ وہ تو مجھ سے بھی عمر میں بڑا ہے۔“

”تو کیا ہوا۔ دولت تو کافی ہے۔“

”اور وہ تو بچوں والا ہے۔ بڑی لڑکی کی شادی ابھی تو ہوئی ہے نا۔“

”ہاں تو کیا ہوا۔“

”اور کلنے بچے ہیں۔“

”تمو۔ تم ہو۔“

”ہاں۔!“

”انھوں نے ہاتھ بڑھا کر ٹبل لمبپ روشن کر دیا۔

منصور نے اُس کا بھیگا ہوا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

”آپ کی طبیعت۔“ ”آواز ہچکی بن گئی۔

”اچھی ہے۔ تمو۔ اماں نے مجھے ناکام واپس بھیجا ہے۔

وہ صرف آنکھیں اٹھا کر رہ گئی۔ جن میں آنسو ابل سے رہے تھے۔

مگر تم مایوس مت ہونا۔ میں سب کچھ چھوڑ دوں گا۔ ہم دونوں کہیں

چلے جائیں گے بہت دور۔ جہاں ان سب کی یاد بھی پاس نہ آئے۔“

”نہیں منصور۔“ ”آواز سسکی سی بن گئی۔

”تمو۔ تم میری زندگی ہو۔ تم سے الگ میں نہیں رہ سکتا۔ منصور نے

اُس کا ہاتھ ہونٹوں سے لگا کر کہا۔

”ناہید نے کچھ کہا۔“ ”وہ سسکیاں بھرتے ہوئے بولی۔

”بہت کہا۔ گرامی پتھر بن گئیں۔ جانتی ہوں انھوں نے کیا کہا۔ وہ انگلی

سے اُس کے آنسو صاف کرتے ہوئے بولے۔

”کیا۔“

”کہ اگر تم نے تمہارے شادی کی۔ تو میں زہر کھا لوں گی!“

”چار اور ہیں شاید۔“ ”مگر بچوں کا کیا ہے۔ راج کرے گی۔ بیوی مر چکی

ہے۔ مگر کتنی سکھی رکھی ہوئی تھی اُس نے۔!“

”میں حیران ہوں۔ تم لڑکی کی ماں ہو کر ایسی باتیں کرتی ہو۔ اگر تجھ کا رشتہ

لڑنا ہوتا۔ تو تم کر دیتیں۔“

”تم تو تجھ کو پہلے بیچ میں لانا۔ میں پوچھتی ہوں۔ تمہاری اولاد نہیں کیا۔“

”میں خود دیکھ لوں گا۔“ ”تم فکر مند مت ہو۔ شفیق الرحمن کہتے ہوئے ہاتھ نکل گئے۔

رات کے کھانے کے بعد تمہارا اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گئی۔ اس کا دل

بار بار چاہ رہا تھا کہ وہاں حضور کے کمرے میں جائے۔

کئی گھنٹے بیت گئے۔ کھر میں ایک ہولناک سانسٹاٹا چھا گیا تو وہ اٹھی

اور منصور کے کمرے کی طرف ہوئی۔

بستی بچھی ہوئی تھی۔ دروازہ کھول کر وہ اندر چلی گئی۔ منصور سو رہے تھے

وہ اُن کے بستر پر بیٹھ گئی۔

منصور کا سانس تیز چل رہا تھا۔ اُس نے اپنے ٹھنڈے برف ہاتھ اس کا

ہاتھ پر رکھ دیے۔

کون۔“ ”منصور ہاتھ سے ٹٹولتے ہوئے بولے۔

”اُس نے اپنا سر اُن کے سینے پر رکھ دیا۔ اور سسک پڑی۔!“

”نہیں۔ نہیں۔!“ تم کو کانپ سی گئی۔

”اور وہ ارادے کی بڑی پکٹی ہیں۔!“

”نہیں منصور۔ میں اتنی اہم نہیں۔ آپ میرے لئے اتنا کچھ نہ کریں۔“

”تمو۔ یوں نہ کہو۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ میرے فیصلے کو ڈمکنا مت۔“

”منصور۔ وہ ہلکی سی چیخ کے ساتھ اُس کے قدموں پر گر پڑی۔

منصور نے اُسے اٹھا کر سینے سے لگا لیا۔

اُسی لمحے رشیدہ باہر نکلی۔ اور منصور کے کمرے کی بتی جلتی دیکھ کر

اس طرف آگئی۔ دروازے سے ہی اُس نے تمو کو دیکھ لیا۔ وہ اُلٹے پاؤں

واپس ہو گئی۔ اور شفیق الرحمن کو جگا کر بولی۔

”تم مجھے پر یقین نہیں کرتے۔ چلو اپنی بھتیجی کے کمرے دیکھ لو چل کر۔“

”کیا کہہ رہی ہو۔“ شفیق الرحمن غصے سے بولے۔

”چلو تو سہی۔“

”اگر ایسا ہوا۔ تو میں اُسے جان سے مار دوں گا۔“

”چلو تو سہی۔!“

دونوں منصور کے کمرے کی طرف چلے گئے۔

تمو اب تک رو رہی تھی۔ اور منصور اُسے یوں تھپکاتا رہے تھے۔ جیسے وہ

ایک سچے تھی۔

شفیق الرحمن کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ وہ فوراً اندہ آگئے اور گرج کر بولے۔

”تمو۔“

تمو اور منصور دونوں ہی کانپ کر علیحدہ ہو گئے۔

تمو نے چچا کو دیکھ کر سر جھکا لیا۔

شفیق الرحمن نے غصے میں آکر اُسے بے اختیار مارنا شروع کر دیا۔ وہ چیخی

چلائی۔ مگر شفیق الرحمن کا غصہ ٹھنڈا نہ ہو رہا تھا

منصور چیخے۔

خالو جان۔ یہ کیا کر رہے ہیں آپ۔

رشیدہ کے منہ میں جو آ رہا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی۔ مجھ بھی آگئی تھی شفیق الرحمن

گھوٹنے، ٹھوکریں۔ اور جو کچھ بھی ہاتھ میں آ رہا تھا مار رہے تھے۔

منصور نے انھیں زبردستی یکٹ لیا۔ تو انھوں نے اس زور سے تمو کو ٹھوکر

مار دی کہ وہ کھڑکی کے ساتھ جا کر لگی۔ کھڑکی کی ٹوک اُس کے سر پر چھ گئی۔ اور

خون بہہ نکلا۔ وہ وہیں گر گئی۔ منصور دوڑ کر اُس کے قریب آئے اور بولے۔

بے حد ظالم ہیں آپ لوگ۔ انھوں نے فوراً گلو کو پانی لانے کو کہا۔ اور

خود کسٹھوٹھوٹھو کر تمو کے سر پر پٹی باندھی۔ غصے میں برا حال تھا۔

مجھ نے ایسے موقع پر ہمدردی دکھائی۔ وہ بھی کسی مطلب کے لئے۔

اور منصور سے کہا۔

”میں نہ کہتی تھی۔ تم میری بات ہی نہ مانتے تھے۔“

”اب تم۔ میراجی اور جلاؤگی۔؟“

رشتہ باہر نکل گئی۔

منصور نے ہنسمت سے بھی کہہ دیا۔

”جاؤ۔ مجھے تنہائی چاہیے۔!“ وہ باہر نکل گئی۔ مگر بڑی خوش تھی۔

گلوٹنوں کے پاس بیٹھا رو رہا تھا۔ اور وہ کھٹی کھٹی نظروں سے اُسے دیکھ

رہی تھی۔

منصور بھی اس کے کمرے میں آگئے۔ اُنہوں نے کئی مرتبہ اُس کے ہاتھ اپنی

آنکھوں سے لگائے۔

تمو۔ میری زندگی۔ بس آج کی رات گزر جانے دو۔ صبح ہی ہم ان سب کو

چھوڑ کر چل دیں گے۔

”آپ ہٹ جائیے۔“

اور گلوٹی مدد سے اس کے کمرے میں لے آئی۔ اور چارپائی پر لیٹاتے

ہوئے حقارت سے بولی۔

”مرتی بھی نہیں۔!“

منصور غصے میں ٹپٹپ رہے تھے۔ شفیق الرحمن اپنے کمرے میں چلے گئے۔

رشتہ بھی اُن کے ساتھ چلی گئی۔

اور ہنسمت منصور کو تسلیاں دینے لگی۔

اُدھر شفیق الرحمن بولے۔

”فیروزہ بڑا کو کہو۔ کہ جہاں تمہاری مرضی ہو۔ رشتہ طے کر دے۔؟“

”حاجی صاحب کے ساتھ۔؟ رشتہ بولی۔“

”ہاں وہیں۔ اور کہے کہ شادی اسی ہفتے میں ہوگی۔“

”اچھا۔ اچھا۔ کہہ دوں گی صبح ہی۔“

اور اب تو وہیں منصور کو ہنسمت بھی نہیں دوں گا۔

”اے واہ۔ وہ کیوں۔؟“

”وہ ہی کچھ خیال کرتا۔؟“

”وہ تو خود ہی اُس کے پیچھے پڑی ہے۔!“

”دیکھا جائے گا۔!“

تو واقعی منحوس ہوں۔ منحوس ہوں۔

اور پھر وہ دیر تک سوچتی رہی۔ اور پھر اس سوچ نے اُسے بالکل بدل کر رکھ دیا۔ وہ اپنے آپ کو بالکل بھول گئی۔ اس کے سامنے دوسروں کی جانیں تھیں۔ منصور کی خوشیاں تھیں۔ مگر اپنا آپ نہیں تھا۔

وہ پتھر سی بنتی جا رہی تھی۔

اور پھر اُسی وقت منصور آگئے۔

”چلو تم۔ تیار ہو جاؤ۔“ میں ابھی ٹیکسی لے آؤں گا۔“

وہ کچھ نہ بولی۔

اٹھو تم۔؟ دیر نہ کرو۔ ہم آج بہت دُور چلے جائیں گے۔ جہاں ہمیں انٹالوں کی یاد تک نہ آنے کی۔ چلو اٹھو۔ تم پھر بھی چپ رہی۔

تم۔ تم بولتی کیوں نہیں۔؟ اٹھو نا۔؟ اٹھو میری زندگی وہ بھٹی بھٹی آنکھوں سے اُسے دیکھتی رہی۔

”تم۔ بولو نا۔ چلو بھی۔؟ اُس نے اُسے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔“

”آں۔ منصور۔ میں نہیں جاسکتی۔! وہ جیسے بہت دُور سے بول رہی تھی۔

کیا کہہ رہی ہو۔ تم اپنے ہوش میں بھی ہو۔

”ہاں۔ میں بالکل اپنے ہوش میں ہوں۔ بھلا کیسے جاسکتی ہوں۔؟“ آخر

پری بھی کچھ عزت ہے۔ میں یوں آپ کے ساتھ نہیں جاؤں گی۔! وہ سنہل کر بولی۔

(۱۷۱)

اور اگلی صبح جب تم کو آنکھ کھلی تو اُسے بے حدامینان تھا۔ آج وہ سب کچھ چھوڑ کر چلی جائے گی۔ منصور کے ساتھ۔ دُور۔ دُکھوں کے دیں۔ دُور۔ اس کا جسم بڑا دکھ رہا تھا۔ سر میں شدید درد تھا۔

اچانک اُسے یوں لگا۔ جیسے سامنے کھڑی ہوئی ناہید کہہ رہی ہے۔

”تمو۔ میں نے کیا قصور کیا ہے۔؟ تم نے مجھ سے میرا بھائی چھین لیا۔ میری ماں نے زہر کھا لیا۔ میں برباد ہو گئی۔

تب وہ کانپ سی گئی۔

تہیدہ بیگم کی عظیم سی صورت اُس کے سامنے آگئی۔ وہ زہر کھا لے گی۔

اور میں خوشیاں مناؤں گی۔ میری ایک زندگی کے لئے کتنی زندگیاں

تباہ ہوں گی۔ ناہید کی۔ اُس کی ماں کی۔ سخمہ کی۔ چچا کی۔ چچی کی اور منصور کی

کیا منصور کو میں اُس کی ماں کی قابلِ نظر نہ آؤں گی۔؟

مجھے دیکھ کر ہمیشہ اُس کو اپنی ماں کی یاد آئے گی۔ سب کہیں گے میں

”تمو۔“ منصور کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

”ہاں۔ منصور۔!“

”دیکھو نمو۔“ میں نے تمہارے لئے سب کچھ چھوڑ دیا۔ کسی کی پرواہ نہیں کی۔“

”غلطی کی۔ میں تو ایسا کبھی نہ کرتی۔“ وہ سختی سے بولی۔

چلو اٹھو۔“ جلدی کرو۔“ وہ اُس کا ہاتھ چوم کر بولے۔

آپ مذاق سمجھ رہے ہیں کیا۔“ میں سچ کہہ رہی ہوں۔ جائیے آپ۔“

”میں جانتا ہوں۔ تم کیوں کہہ رہی ہو۔ مجھے کسی بات کا ذکر کہ نہیں چلو چلیں۔“

”منصور۔ خدا کے لئے مجھے تنگ نہ کرو۔ جاؤ۔!“

منصور نے پیار سے سمجھایا۔ غصہ دکھایا۔ مگر تمو پتھر بنی رہی۔ اور پھر منصور بری طرح جھلائے۔

”تمو۔ میں آخری بار کہہ رہا ہوں۔ چلو۔“

”نہیں منصور۔ جاؤ۔“

”تم نہیں مانتیں۔“

”نہیں۔!“

غصے میں منصور نے اُسے تختہ مار دیا۔

وہ ہنس پڑی۔

”اب تو چلو۔“ وہ پھر بولے۔

”نہیں۔!“ وہ سختی سے بولی۔

تب وہ اپنے ہاتھ کو گھومتے ہوئے باہر نکل گئے۔

اُن کا رنگ غصے میں سرخ ہو رہا تھا۔ چہرے کی رگیں ابھر آئی تھیں۔ اور

عجیب سی پریشانی ٹپکتی تھی۔ اُن کے جانے کے بعد وہ سسک کر رو دی۔

اُسے پتہ نہ چلا۔ کہ باہر کیا ہو رہا ہے۔ فیروزہ بوا آئیں۔ اور حاجی عبدالصمد سے رشتے کا سن کر خوشی خوشی لوٹ گئیں۔

شادی طے کر دی گئی۔ تین دن بعد۔ حاجی عبدالصمد کو کیا چاہیے تھا۔

وہ بڑے ہی خوش ہوئے۔ فیروزہ بوا کو خوب انعام دیا۔

رشیدہ نے فہمیدہ بیگم کو نار دے دیا تھا کہ حالات خراب ہیں۔ اور وہ فوراً آجائیں۔

شام تک وہ بھی آگئیں۔ ناہیدہ بھی ساتھ تھی۔

منصور شام تک گھر نہ آئے۔ ناہیدہ نمو کے کمرے میں آئی۔ تو وہ لیٹی ہوئی تھی۔ گلو اُس کے سر ہانے دودھ لئے کھڑا تھا۔

ناہیدہ کو دیکھ کر وہ مسکرائی۔

کیا ہوا نمو۔“ وہ اُس کے سر پر پی بندھی دیکھ کر بولی۔ چوٹ لگ گئی ہے۔!

وہ نقاہت سے بولی۔

ناہید نے دیکھا۔ تم بے حد درد ہو رہی ہے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے برسوں کی بیمار ہو۔

”نہیں ناہید!“

”تمہاری شادی ہو رہی ہے۔!“

”اچھا۔ وہ مسکرائی۔ اور پھر بولی۔

”کب۔“

”پرسوں۔!“

وہ ہنس پڑی۔ ایسی ہنسی۔ جس پر رونے کا گمان ہوتا تھا۔

تمو۔ تمہیں کچھ معلوم نہیں تھا۔

اُس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

”بڑا ظلم ہو رہا ہے۔!“ ناہید رد مانسی ہو گئی۔

وہ صرف مسکرا دی۔

”سنا ہے۔ وہ تم سے عمر میں بہت بڑا ہے۔ تمہاری عمر کی اُس کی بیٹیاں ہیں۔!“

وہ آنکھیں بھاڑ کر سنتی رہی۔ مگر منہ سے ایک لفظ نہ بولی۔

باہر سے ہنسی ٹپٹے تھے۔ شفیق الرحمن کا دماغ کچھ اس قدر ماؤٹ تھا۔ کہ وہ

کچھ سوچ نہ رہے تھے۔

ہمیدہ بیگم اُن سے باتیں کر رہی تھیں۔ اور اُن کا دماغ کہیں اور تھا۔

”اے میں نے کہا۔ بھائی صاحب کوئی اچھا رشتہ دیکھنا تھا۔ یہ جوڑ

تو بالکل مناسب نہیں معلوم ہوتا۔!“ ہمیدہ بیگم اپنی نفرت کو نفرت میں نہ

”کچھ بیمار ہو گیا۔“ وہ قریب بیٹھ کر بولی۔

”نہیں تو۔!“ اُس کی آنکھیں چھلک آئیں۔

اتنی بھی آئی ہیں۔ ناہید نے بتایا۔

”اچھا۔!“ وہ مسکرائی۔

”شادی ہو رہی ہے نا۔“

”کس کی۔“ تمو نے کہا۔

”تمہیں نہیں معلوم کیا۔“ ناہید کی حیرت سے آنکھیں پھیل گئیں۔

نہیں تو۔ وہ کمزوری آواز میں بولی۔

ناہید چپ سی ہو گئی۔

”چپ کیوں ہو گئیں۔ بتا دنا۔“

وہ پھر بھی خاموش رہی۔

”اچھا میں سمجھ گئی۔ مجھے کی ہو رہی ہوگی۔ ہے نا۔“

”اُس کی بھی چند دن بعد ہو جائے گی۔ مگر اب تو۔!“

”اب کس کی ہو رہی ہے۔“

”تمہیں واقعی کچھ معلوم نہیں۔“ ناہید ہچکچا کر بولی۔

نہ بدل سکیں۔ تو کہہ ہی بیٹھیں۔

”ٹھیک ہے۔!“ اس کی قسمت ہی ایسی ہے شفیق الرحمن پریشان سے بڑے
اے آیا۔ راج کرے گی۔ اتنی دولت ہے۔ بوڑھے آدمی میں زیادہ دیر توڑی
جیں گے۔ جائداد اسی کے نام ہو جائے گی! رشیدہ فوراً بولیں۔
”اللہ سے ڈرو رشیدہ۔ ابھی سہاگن تو موٹی نہیں۔ تم اُسے میوہ بنا رہی ہو۔
تم بھی بیٹیوں والے ہیں۔ لوگ کیا کہیں گے۔ کم بخت تیم ہے۔!“
گل بھی تو خوب کھلائے ہیں اُس نے۔ رشیدہ نے کہا۔
”بھائی صاحب۔ کیا تم کو بھی پوچھا ہے۔؟“ فہمیدہ بولیں۔
اُسے تو شاید پتہ بھی نہیں۔ کہ برسوں اُس کی شادی ہو رہی ہے شفیق الرحمن
طنتریہ مہنتے۔

”اے ہے۔ یہ تو ظلم ہے۔ اُس سے پوچھ لیا جاتا۔
”تو آیا اب کیا ہو سکتا ہے۔ حاجی عبدالصمد کے ہاں تو کھلواد رہا ہے؟
”مگر دنیا دکھا دے کو تو پوچھ ہی لیتے۔؟“ فہمیدہ پھر بولیں۔
اب ضرورت نہیں رہی۔؟ شفیق الرحمن بولے۔
نہیں بھیا پوچھ لو۔؟ فہمیدہ نے زور دیتے ہوئے کہا۔
”چلئے۔ پوچھ ہی لیجئے۔ کل کو لگہ تو نہیں دے گی۔ ویسے میرا خیال ہے وہ
انکار کر دے گی۔؟“ رشیدہ نے کہا۔

”نہیں اب کیا کرنا ہے۔ پوچھ کر۔؟ شفیق الرحمن جان گئے تھے کہ یہ
ظلم ہو رہا ہے۔

”نہیں بھیا چلو میں تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔
”فہمیدہ کے زور دینے سے شفیق الرحمن بادل ناخواستہ کرے کی طرف آئے
ناہی اُنھیں دیکھ کر مٹ کر بیٹھ گئی۔
آداب۔ منو! کھٹے ہوئے بولی۔ مگر کرب کے آنا اس کے چہرے پر عیاں تھے
”لیٹی رہو۔؟“ فہمیدہ بیگم سرد جہری سے بولیں۔

”یہ تمہارے چچا پوچھنے آئے ہیں تمہیں۔ تمہارا رشتہ اُنھوں نے طے کر دیا ہے؟“
تمو سر جھکا کر بیٹھی رہی شفیق الرحمن بھی چپ چاپ کھڑے رہے۔
فہمیدہ بیگم پھر خفا طبع ہوئیں۔

”حاجی عبدالصمد کے ساتھ رشتہ طے کیا ہے۔ اگر تم کچھ کہتا چاہتی ہو تو
کہہ دو۔؟“

”ہاں ہاں۔ اسے اگر منظور نہ ہو تو کہہ دے۔ میں انکار کر دوں گا اس کی
معصوم صورت دیکھ کر شفیق الرحمن کی ہمدردی جاگ اٹھی۔
تمو کا جی اُٹھ رہا تھا۔ یوں لگتا تھا۔ جیسے جگر کٹ کر باہر نکل آئے گا۔ حلق
میں گھٹن سی ہو رہی تھی۔ وہ بڑی مشکل سے ضبط کر رہی تھی۔

”ہاں ہاں۔ انکار کرنا چاہو تو بے دھڑک کر دو۔ تمہیں کوئی کچھ نہ کہے گا۔؟“

نہیدہ بیگم ہمدرد لہجے میں بولیں۔

ناہیدہ کے چہرے پر خوشی کے آثار پیدا ہو گئے۔ اُس نے تم کو ٹھوکا دیا اور آہستہ سے بولی۔

”انکار کر دو۔“

تم کو نے ایک نظر چچا کو دیکھا۔ اور آہستہ سے بولی۔

”بہت اچھا کیا۔ آپ سنے۔ مجھے آپ کا فیصلہ منظور ہے۔“

رشتہ خوش ہو گئی۔ نہیدہ بیگم کا دل رونے کو چلا۔ اور شفیع الرحمن اُس کے سر پر ہاتھ رکھ کر نیزی سے باہر نکل گئے۔ اور رشتہ بھی باہر نکل گئیں تو ناہیدہ جیسے پھٹ پڑی۔

”یہ کیا کیا تم نے تم کو۔ کیوں انکار نہیں کیا؟“

وہ خاموش رہی۔ لیکن آنسو جو بند توڑنے کی کوشش کر رہے تھے بند توڑ کر بہہ نکلے۔

پھر وہ اتنا روئی۔ اتنا روئی کہ خُلق خُلق ہو گیا۔ ناہیدہ نے اُسے پانی لاکر پلا دیا۔

منصور کی آواز باہر آئی۔ تو ناہیدہ بھاگ گئی۔

منصور کی حالت دیکھ کر ناہیدہ تڑپ اٹھی۔ بکھرے ہوئے بال میلا کپڑے بڑھی ہوئی نینو۔

بھائی جان۔ کیا حالت ہو گئی ہے آپ کی۔ وہ ڈرتے ہوئے بولی۔
”نم کب آئیں ناہیدہ۔؟ وہ کھوئے کھوئے سے بولے۔
”آج ہی۔ اتنی بھی آئی ہیں۔“

”اچھا۔ مگر کیوں۔؟ سوال کھویا کھویا سا تھا۔
”وہ۔ بھائی جان۔ تم کو کی شادی ہے نا۔؟“ وہ ہچکچاتی ہوئی بولی۔
”تم کو کی شادی۔؟ منصور پر گویا بم گر پڑا تھا۔
ہاں۔! وہ ڈر سی گئی۔“

”کہاں۔؟“

”یہیں پر کوئی ہیں۔!“ ناہیدہ نے بات چھپانا چاہی۔
”آخر کون ہے وہ منصور بے قرار لہجے میں بولے۔“

”وہ کوئی حاجی عبدالقادر ہیں۔ ناہیدہ کی آواز بھرا گئی۔“

جی ہاں۔ اور تم کو کی مرضی اس میں شامل ہے۔ اقرب سے ہی سنجیدگی آئی۔
”کیا کہتی ہو۔؟ تم کو کی مرضی۔؟“

”ہاں بھائی جان۔ ابھی ابھی خالو جان، خالہ اور اُمی اس سے پوچھنے گئے تھے۔“

”تو پھر۔؟“

”اُس نے کہا مجھے منظور ہے۔ بھئی وہ عقلمند لڑکی ہے حاجی عبدالقادر۔“

کی دولت کا اُسے اندازہ ہے۔ کیا ہوا اگر بوڑھا ہے۔ قدر تو کرے گا اس کی اور ماں بچے ہیں تو ان کا کیا۔ وہ تو بڑی عمر کے ہیں۔ کچھ کی شادی ہو چکی ہے کچھ کی ہوجائے گی۔ بچہ منظور کے دل پر مزید چر کے لگانے کے لئے بولی۔ وہ اس سے زیادہ کچھ نہ سن سکے۔ سادہ اپنے کمرے میں اکر اپنے پلنگ پر گر پڑے۔

آہ۔ تم۔ تم کیوں نہیں سوچتیں۔ منظور تمہاری جان ہے۔ وہ تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ تم اُس کی رگ و جان میں سا گئی ہو۔ تم تو تمہارے لئے وہ سب کچھ چھوڑ دے گا۔ اگر تم کہو تو سب کچھ تم نہیں جانتیں۔ تم کیا ہو؟

یہ تم نے کیا کیا۔ شادی کے لئے کیوں منظور کی دیدی؟ اور وہ بھی کس کے ساتھ۔

میں جانتا ہوں تم۔ یہ ساری قربانی تم میرے لئے دے رہی ہو۔ تم نہیں جانتی کہ ناہید کا بھائی اُس سے بگڑ جائے۔ تم نہیں جانتیں کہ ماں سے بیٹا علیحدہ ہو جائے۔ تم نہیں جانتیں کہ دو گھروں میں پھوٹا بڑے۔ اور اسی لئے تم جہنم میں جانے کے لئے تیار ہو گئی ہو۔ ایک جہنم سے دوسری جہنم میں۔

آہ۔ کم جست۔ تم اپنے لئے کیوں نہیں سوچتیں۔ تم بھی تو انسان ہو۔

تمہارے دل میں بھی تو اُمنگیں ہیں۔ حسرتیں ہیں۔ لاکھوں آرزوئیں ہیں۔ کیا تم اُن اُمنگوں کو یونہی دبا دینا چاہتی ہو۔ حسرتوں پر مٹی ڈال دینا چاہتی ہو۔ آرزوؤں کا گلا گھونٹ دینا چاہتی ہو۔؟ تم نے کون سا سکھ دیکھا ہے دنیا میں۔؟

نہیں تم۔ میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ میں جانتا ہوں تم مجھے بے انتہا چاہتی ہو۔ اور میرے لئے ہی اپنا آپ قربان کر رہی ہو۔ مگر تم میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ میں تمہیں لے جاؤں گا۔ دُور۔ اس دکھوں کی دنیا سے دُور۔ جہاں تم ہو گی اور میں۔ اور زندگی حسین ہو گی۔ میں بھی سب کچھ بھول جاؤں گا۔ اور تم بھی بھول جانا۔

وہ اپنے خیالوں میں گم تھا۔

اُسے پتہ بھی نہ چلا کہ فہمیدہ بگم کب سے اُسے کھڑی دیکھ رہی ہیں۔ آخر نہ رہ سکیں۔ تو اُس کے قریب بیٹھ گئیں۔ اور پیار سے بال ٹھیک کرتے ہوئے بولیں۔

”بیٹا۔؟“

منصور نے پلٹ کر ماں کو دیکھا۔ اور پھر منہ پھیر لیا۔

”آؤ۔ کھانا کھا لو۔؟“

”مجھے بھوک نہیں!“

”آؤ بیٹا۔ ضد نہ کرو؟“

”نہیں۔ میں نہیں کھاؤں گا۔ آپ جانیے؟“

”نہیں بیٹا۔ آؤ۔؟“

فہمیدہ میگم نے بہت اصرار کیا۔ مگر وہ نہ مانے۔ آخر وہ رنجیدہ ہو کر باہر نکل آئیں۔

اور منصور یونہی پڑے پڑے سو گئے۔ کافی دیر بعد فہمیدہ میگم آئیں۔ اور اُسے کبل اوڑھا کر اُسے دیکھنے لگیں۔ آنسو منصور کے چہرے پر جمے ہوئے تھے۔ ان کا کلیجہ کانپ گیا۔ وہ ٹرپ گئیں اور پھر باہر نکل گئیں۔

(۳۸)

صبح ہی سے رشیدہ تباری میں لگی ہوئی تھی۔ سنجہ بھی ساتھ لگی تھی۔ ناہمیدہ ناشتہ لے کر تلو کے پاس گئی۔ تودہ بے حد زرد ہو رہی تھی۔

”کیوں تم تو خیریت ہے نا۔؟ تمہاری طبیعت اچھی ہے؟ وہ گھبرا کر بولی۔
ہاں۔ اچھی ہوں۔! وہ نقاہت سے بولی۔ مگر اُس کے ماتھے پر
پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔

”لو ناشتہ کر لو۔؟“ ناہمیدہ ہمدردی سے بولی۔

”دل نہیں چاہتا۔!“

”تھوڑا سا دودھ پی لو۔ پھر۔؟“

”اچھا لاؤ۔! اُس نے گلاس تھام لیا۔ اور چند گھونٹ پی کر گلاس واپس دے دیا۔

”کیوں۔؟“

”بس طبیعت نہیں چاہ رہی۔

اُسی وقت سنجہ آگئی۔ اور ہلستی ہوئی بولی۔

دیکھا آپ نے امی۔ ان کی حالت کیسی ہو رہی ہے ناہید بولی۔
 ”ہاں۔ کیا کروں۔ مصیبت میں بھنس گئی ہوں۔

خدا کے لئے امی۔ کچھ کیجیے۔

اب میرے کرنے کو کیا باقی رہ گیا ہے۔

اُسی لمحے منصور کمرے سے نکل آئے۔ نجمۂ ہنسی ہوئی خربا اگلی اور بولی۔

چلئے۔ آپ کو حاجی صاحب سے ملواؤں؟ وہ برآمدے کی طرف اشارہ

رتے ہوئے بولی۔

”کون حاجی صاحب۔؟“ منصور تیز لہجے میں بولے۔

تمو کے ہونے والے شوہر۔ ادہ تہنہ لگا کر بولی۔

بکومت۔ منصور غصے میں چیختے ہوئے کہنے لگے۔

نجمۂ سہم سی گئی۔ مگر پھر زور سے ہنستی ہوئی برآمدے کی طرف چلی گئی۔

حاجی صاحب شفیع الرحمن سے نکاح کا ٹائم وغیرہ فکس (مقرر) کرنے آئے

تھے۔ اور شرائط وغیرہ بھی پوچھ رہے تھے۔

شفیق الرحمن بے چارے تو چپ بیٹھے تھے۔ البتہ رشیدہ سلیم کی زبان

قینچی کی طرح چل رہی تھی۔

آخر وہ ایک گھنٹہ بیٹھ کر چلے گئے۔

منصور المہینان سے غسل کرنے لگے۔ اور پھر کپڑے بدل کر باہر چلے گئے۔

”تمو کے ہونے والے دو لکھا آئے ہیں۔؟“

”تو میں کیا کروں۔؟“ ناہیدہ جل کر بولی۔!

”چلو۔ چل کر دیکھ لو۔؟“ ہنسی۔

”نجمۂ۔ خدا سے ڈرو۔ تمہیں مذاق سوجھ رہا ہے۔!“

ناہیدہ کو غصہ آگیا۔

”ارے۔ اس میں غصے کی کیا بات ہے۔ شادی کے دن تو چھیڑا ہی جاتا

ہے۔! کیوں تم۔؟ نجمۂ ہنس کر کہنے لگی۔ ”ہاں۔ ہاں۔ سچ تو کہہ رہی ہے۔

نہ تم کیوں منع کرتی ہو ناہید۔؟ یہ بُرا مان جائے گی۔!“ نمو آہستہ سے بولی۔

فہمیدہ سلیم نے ناہیدہ کو آواز دی۔ تو نجمۂ بھی اُس کے ساتھ باہر نکل آئی۔

”دیکھا تم نے حاجی صاحب کو۔؟“ فہمیدہ سلیم جل کر بولیں۔

”نہیں تو۔!“

”وہ دیکھو۔ تخت پوش پر بیٹھے ہیں۔“

وہ۔؟ ناہیدہ کی ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

”ہاں۔ ہے ناظم۔؟“

یہ تو بالکل ظلم ہے۔ امی جان۔ خدا کے لئے آپ ہی کچھ کیجیے؟ ناہیدہ رونا لڑاؤ

میں کروں۔ میری کون سُنتا ہے۔ اور پھر مجھے تمہارے بھائی کی طرف سے

بھی ڈر ہے۔!

”ایک بات میری مانیں گے۔ آپ۔“

کیا۔؟ شفیق الرحمن بولے۔

”ٹھکرائیں گے تو نہیں۔؟ وہ بھرائی ہوئی آوازیں بولی۔

”نہیں۔!“

”اس کے بعد میں آپ کو کچھ نہ کہوں گی۔ آپ میرے ابو بھی ہیں نا۔؟“ وہ ضبط کرتے ہوئے بولے۔

ہاں ہاں۔! شفیق الرحمن کی آنکھیں جھلک آئیں۔

”تو پھر وعدہ کیجیے۔؟“

”وعدہ رہا۔!“

”نہیں۔ وعدہ کیجیے۔ اور جو کچھ میں کہوں گی۔ اُس پر ابھی عمل ہوگا۔؟“

”ہاں ہاں۔ وعدہ رہا۔!“

اور فہمیدہ یکم سمجھیں۔ کہ تموا بھی شادی سے انکار کر دے گی۔ یا پھر منصور کے لئے وعدہ کر رہی ہے۔ وہ کچھ ڈر سی گئی۔ مگر منو کے منہ سے کچھ اور سن کر وہ حیران رہ گئیں۔

چچا میاں۔ یہ کئی جوہلی سرخ جو ہے نا؟ یہ میری طرف سے ناہید کے نام لکھ دیجیے۔ یہ اُس کے جینز میں۔

اور باقی تمام جائداد سجتہ کے نام کر دیں۔ اور اُس کے جینز میں؟“

ناہیدہ تنو کے پاس چلی گئی۔

شفیق الرحمن اُس کی جائداد کے کاغذات اُس کے پاس لے گئے۔ رشید بہتر اچھی۔ مگر شفیق الرحمن نے ایک نہ سنی۔

میں نے کہا۔ پاگل ہو گئے کیا۔؟ تمام جائداد دے رہے ہو اُس کو۔؟

”اُسی کے حصے کی دے رہا ہوں۔ تم اب ایک لفظ بھی مت بولو۔؟“

شفیق الرحمن غصے میں بولے۔

مگر آخر کو سجتہ بھی تو۔ رشیدہ چچی۔

”سب ٹھیک ہے۔ تنو کا حصہ اُسے ہی ملے گا۔ اگر تم نے ایک بات بھی

منہ سے نکالی۔ تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔!“

شفیق الرحمن گرج کر بولے۔

رشیدہ منہ لبسورتی رہ گئی۔ اور وہ فہمیدہ یکم کو ساتھ لے کر تنو کے پاس آگئے۔

”وہ لیٹی ہوئی تھی۔ چچا کو دیکھ کر اٹھ بیٹھی۔

شفیق الرحمن اُس کا چہرہ دیکھ کر دھک سے رہ گئے۔ زرد ستا ہوا چہرہ۔

جس پر دُنیا کی پریشانیوں اور اُداسیاں بکھری ہوئی تھیں۔

”یہ تمہاری جائداد ہے تنو۔؟ میں نے تمہارے نام لکھ دی ہے۔ تم بھی

اپنے دستخط کر دو۔ اور کاغذ سنبھال کر رکھ لو۔؟“

تنو نے خاموشی سے کاغذ لئے۔ اور بولی۔

”یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔“ شفیق الرحمن کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

”ہاں چچا میاں۔!“

مگر تم۔ ایسی باتیں کیوں کر رہی ہو۔“ فہمیدہ بیگم نے کہا۔

یوہنی۔ پھر تو شاید مجھے کوئی نہ کرنے دے۔ دیکھیے چچا میاں آپ نے وعدہ کیا ہے نا۔“

نہیں بیٹی۔ یہ کیونکر ہو سکتا ہے۔“ شفیق الرحمن آنسو پونچھ کر بولے۔

آپ میرا دل توڑ رہے ہیں۔ وہ آنسوؤں کے درمیان بولی۔

”مگر۔“

آپ نے وعدہ کیا ہے۔

”لیکن۔“

”میں آپ سے کبھی نہ بولوں گی چچا میاں۔“ وہ سسکی بھرتے ہوئے بولی۔

اچھا اچھا۔ ابھی لکھ دیتا ہوں۔

تب ہی خوش سی ہو گئی۔

آپ کتنے اچھے ہیں چچا میاں۔ کیا میرے آلبو بھی ایسے ہی تھے۔“

دادی آتاں تو بہت اچھی تھیں۔ اور اکو۔“

ہاں بیٹی۔ تمہارے آلبو بہت اچھے تھے۔ شفیق الرحمن کی آواز بھرا گئی۔

چچا میاں۔ آپ نے مجھے معاف کر دیا۔ وہ آہستہ سے بولی۔

مجھے شرمندہ نہ کرو۔ میں تو اپنے آپ کو کبھی معاف نہ کروں گا۔ میں نے تمہارے پھول سے جسم پر کیا مارا ہے۔

مارا ہے۔ فہمیدہ بیگم حیرت سے بولیں۔

ہاں۔ میں نے اُسے بہت مارا ہے۔ وہ رو پڑے۔

فہمیدہ بیگم نے منہ کو سینے سے لگا لیا۔ تب روتے ہوئے اُس کی چیخیں گلنے لگیں۔

چپ ہو جاؤ۔ بیٹی۔!

ناہیدہ نے پانی لا کر پلایا۔ فہمیدہ بیگم اور شفیق الرحمن باہر نکل گئے۔

پھر وہ منہ چھپا کر لیٹ گئی۔ ناہیدہ قریب بیٹھی رہی۔

سہ پہر کو منصور آئے۔ وہ سیدھا منہ کے کمرے میں آگئے۔ ناہیدہ کو دیکھ کر بولے۔

گھر والے کہاں ہیں۔

اُس طرف ہیں۔!

منور منہ چھپائے سوئی تھی۔

منصور اُس کے منہ سے کپڑا ہٹاتے ہوئے بولے۔

تمو۔“

اُس نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔

ناہیدہ باہر نکل گئی۔

تب وہ قریب ہی بیٹھ گئے۔ اس کے ماتھے پر اپنے ہونٹ رکھتے ہوئے لہلہ۔

”اٹھو۔ جان منصور۔“

وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

آپ کو۔ یوں۔ میرے کمرے میں نہیں آنا چاہیے تھا۔ وہ جھجکتے ہوئے بولی۔
”بگلی۔ وہ اُس کا ہاتھ والہا نہ چومنے لگے۔“

”جائیے۔ کوئی آجائے گا۔ وہ آواز دبا کر بولی۔“

”آجائے۔ میں کسی سے نہیں ڈرتا۔ چلو میں سب انتظام کرایا ہوں۔“

”کیا انتظام۔“

سیٹیں بک کر دیا ہوں۔ اور جانتی ہو۔ اسپتال بھی استغفی دے آیا

ہوں۔ اب ہم جہاں جائیں گے۔ میں اپنی پرکیٹس کروں گا۔ ٹھیک ہے نا۔

وہ کہہ رہا تھا۔ اور اُس کے چہرے پر خوشی کے جذبات نمودار ہو رہے

تھے۔ جاتے ہی ہم شادی کریں گے۔ پھر گھر لیں گے۔ اور میں کوئی دوکان لوں گا۔

ٹھیک ہے نا۔“

”آپ۔ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟“

”نمو۔ ہوش میں آؤ۔ چلو۔ اٹھو۔“

مگر میں کیسے جاسکتی ہوں۔ وہ آواز میں سختی لاتے ہوئے بولی۔

میں نہیں۔ زبردستی لے جاؤں گا۔

”نہیں منصور۔“

”ضد نہ کرو۔“

”منصور۔!“

”کیا ہے۔“

میری ایک بات امنیں گے۔

”میں تمہاری کوئی بات ماننے کو تیار نہیں۔“

”صرف۔ ایک بات۔“

”کیا۔“

”آپ کو مجھ سے پیار ہے نا۔“

”تم نہیں جانتیں کیا۔“

”جانتی ہوں۔“

”تو پھر۔“

”میں آپ کو بہت عزیز ہوں نا۔“

”جان سے بھی زیادہ۔!“

تو پھر آپ کو میری جان کی قسم۔ واپس لوٹ جائیے؟

”نمو۔“ وہ چیخ کر بولے۔

ہاں منصور۔ میری جان کی قسم۔ میرا خیال چھوڑ دیں؟

”تمو۔ میں زندہ نہ رہ سکوں گا۔“
 ”خدا نہ کرے۔!“ وہ اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر بولی۔
 ”تمو۔ خدا نہ کرو۔“

”آپ کو میں عزیز نہیں۔“
 ”اوہ۔ میں کیا کروں۔“ وہ بے تابی سے ٹہلنے لگے۔
 ”جائیے۔!“

”جاؤں۔“ وہ بھاری اور غمگین آواز میں بولے۔
 ”ہاں۔!“
 ”جاؤں۔“ وہ پھر بولے۔
 ”ہاں۔ خدا حافظ۔“

تنب وہ بڑے درد سے اُسے دیکھتے ہوئے باہر نکل گئے۔ اور وہ
 غم ناک سی ہنسی ہنس دی۔

(۳۹)

”منصور کی رات بڑی مشکل سے گزری۔“
 ”تمو تو ساری رات چھت کو کھورتی رہی۔“
 صبح منصور ناشتہ کئے بغیر باہر نکل گئے۔ رشیدہ تمام گھر میں جستجو پھر
 رہی تھیں۔
 ”شام چار بجے نکاح ہو رہا تھا۔“
 رشیدہ تمو کے کمرے میں آکر ناہیدہ سے کہنے لگی۔
 ”اسے غسل وغیرہ کروادینا تھا۔“
 ”کروادوں گی۔ ناہیدہ آہستہ سے بولی۔
 ”سنا ہے۔ بہت زیادہ اور کپڑا آ رہا ہے۔ کہتے ہوئے رشیدہ باہر
 نکل گئیں۔“

”غسل کرو گی۔“ ناہیدہ بے دلی سے بولی۔
 ”رہنے دو۔ دل نہیں چاہتا۔“
 ”اچھا تو۔ کپڑے بدل لو دھلے ہوئے۔“

تنبہاری مرضی۔

ناہید نے جب تنہو کو کپڑے پہنائے تو اس کے جسم پر نیل دیکھ کر اس کے آنسو آئے مگر وہ چپ رہی۔

ابھی وہ کپڑے بدل کر بیٹھی تھی کہ اس نے باہر زور زور سے رٹنے کی آواز سنی۔ آواز اس کی مالی کی تھی۔

ہائے اللہ۔ اماں کیوں رو رہی ہیں۔؟ وہ بھاگ کر باہر نکل گئی۔

تمو حیران پر نشان اٹھ کر باہر نکلی۔ تو دیکھا۔ سب ہی رو رہے ہیں۔ اسے دیکھ کر رشیدہ اس کی طرف لپکی۔ اور اس کے بال کھینچے ہوئے بولی۔
”ڈائن۔ کلومی مخوس“

”ہائے تیری نحوست منصور کے لئے ہی رہ گئی تھی۔

نجمہ بھی روتے ہوئے اسے گالیاں دیتے لگی۔

ہائے یہ تو زندہ ہے۔ یہ کیوں نہ مر گئی۔ فہمیدہ بیگم سینہ کوٹ کر بولیں۔ وہ حیران سی ان کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

تنہا تنہا رو کر بولی۔

ہائے۔ تم میرے بھتیجا کا ایکسی ڈنٹ ہو گیا ہے۔ وہ اسپتال میں ہیں۔

اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کا سانس رُک گیا ہو۔ کانوں میں سیسہ سا پگھلنا محسوس ہوا۔ وہ چکر کر دھم سے نیچے گر گئی۔

رشیدہ زور زور سے روتے ہوئے بولی۔

ہائے۔ میں تو پہلے ہی کہتی تھی کہ یہ مخوس ہے۔ یہ مخوس ہے۔ مگر میری کوئی سنتا ہی نہ تھا۔ دیکھ لیا۔؟ آج اس کی شادی ہے۔

تو کیا ہو گیا۔

گلو آکر بولا۔

”بی بی جی۔ ٹیکسی آگئی ہے۔ چلے۔؟“

تنہا فہمیدہ بیگم ننگے پاؤں باہر کی طرف بھاگیں۔ اماں سب کے برقعے لے آئیں۔ سب ہی سوائے تنہو کے اسپتال چلے گئے۔
تمو یونہی صحن میں پڑی تھی۔

ان کے جانے کے بعد اماں کو ترس آگیا۔ اس نے پانی کے چھینٹے منہ پر دیے۔ جب تنہو کو ہوش آیا تو گھر خالی تھا۔ وہ پاگلوں کی طرح سارے گھر میں دوڑی۔

اسے یوں لگ رہا تھا جیسے دل کے زخموں کے ٹھانگے اڑھٹ گئے تھے۔ اور ان میں سے خون ٹپک رہا تھا۔

وہ پاگلوں کی طرح ہر طرف گھور رہی تھی کہ اماں آگئی۔ اور بولی۔

”اللہ ایسے نصیب کسی کے نہ کرے۔“

کیسے نصیب۔؟ وہ ڈر کر بولی۔

”جی۔ بی بی جی۔ مگر ڈاکٹر کہتے ہیں۔ وہ بچیس گئے نہیں۔!“
 چلو گلو۔ مجھے لے چلو۔؟ وہ تڑپ کر بولی۔

مگر بی بی جی۔ بڑی بی بی آپ کو مار ڈالیں گی۔
 گلو۔ چلو ہم چوری سے چلتے ہیں۔ تم مجھے کسی گھڑکی کے ذریعے منصور
 کو دکھا دینا۔؟ رو رو کر کہتے لگی۔

”چلیے۔ اگلو اس کا ہاتھ پکڑ کر اس کے ساتھ چلنے لگا۔ کچھ دیر بعد وہ
 اسپتال پہنچ گئے۔

اسپتال میں عجیب حال تھا۔ ایک ایک نرس بھاگی جا رہی تھی۔ کپاؤنڈر
 بدحواس سے ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔

تمہ کے پاؤں میں کنکر چھب گئے تھے۔ اس کی سانس جواب دے گئی تھی
 وہ بڑی طرح مانپ رہی تھی۔

بی بی جی۔ وہ دیکھیے۔ اس کمرے میں ہیں منصور صاحب۔ مگر کمرے
 کے باہر تو سب بیٹھے ہیں۔

تمہ نے دیکھا۔ ناہید۔ رشیدہ۔ نجمہ۔ اور فہمیدہ سب وہیں۔ تب وہ
 جلدی سے دیوار کی آڑ میں ہو گئی۔

”وہ اب بی بی جی۔؟“

چلو۔ پھلی طرف سے چلتے ہیں۔! وہ مانپتے ہوئے بولی۔

”تم جیسے بیٹے۔ کیا نصیب پایا تم نے۔ پیدا نہیں ہوئی تھیں تو باپ مر گئے
 پیدا ہوئی تو ماں مر گئی۔ اور پھر کیسے تمہاری دادی نے نہیں جوان کیا۔ اب
 شادی ہو رہی تھی تو منصور۔ سیاں۔

کیا ہوا منصور۔؟ وہ ڈر کر بولی۔

”ایسی ڈنٹ ہو گیا ہے۔ شفیق الرحمن کہہ رہے تھے کہ سڑک پر بادلوں
 کی طرح جا رہے تھے۔ ادھر ادھر سے موٹریں مارن دے رہی تھیں۔
 مگر انھیں کوئی پتہ نہ چل رہا تھا۔ پھر عقب سے ایک موٹر نکلی اور دوسری
 طرف سے بھی۔ منصور دونوں میں پس کر رہ گئے۔“

نہیں منصور۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ وہ زور سے چیخی۔ وہ اسی طرح باہر
 نکل گئی۔ سر پر صرف ایک دوپٹہ تھا۔ پاؤں میں چپل بھی نہیں تھی۔ ماما سے
 روکتی رہ گئی۔ مگر وہ باہر نکل گئی۔

اس کا دل غم سے پھٹ رہا تھا۔ اب وہ پوری طرح ہوش میں تھی۔
 آہ منصور۔ یہ کیا کیا تم نے۔ مجھ پر نصیب کے لئے اتنی بڑی قربانی۔

گلی کے موڑ پر اسے گلو ملا

آپ۔ بی بی جی۔؟ وہ حیرت سے بولا۔

ہاں گلو۔ چلو مجھے بھی اسپتال لے چلو۔ مگر مجھے یہ تو بتاؤ۔ میرا منہ

زندہ ہے نا۔؟ وہ بے قراری سے بولی۔

مگر آپ کی حالت تو بہت خراب ہو رہی ہے۔

میری پردہ نہ کرو گلو۔ چلو میرے بھتیجا۔ میرا ہاتھ پکڑ کر لے چلو مجھے۔
تب گلو اس کا ہاتھ پکڑ کر دوسری طرف لے گیا۔ راستے میں ایک وارڈ
پڑتی تھی۔ بڑی مشکل سے گرتی پڑتی تموخل رہی تھی۔

یہ کھڑکی ہے شاید اس کمرے کی۔ گلو نے جھانک کر اندر دیکھا۔
تمو نے جھانک کر دیکھا۔ منصور کا چہرہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ کسی ڈاکٹر
اور نرسیں اس پر تھکی ہوئی تھیں۔

وہ ہانپتی ہوئی وہیں کھڑی ہو گئی۔ پاؤں سے خون بہہ رہا تھا۔ سارا
جسم پسینہ پسینہ ہو رہا تھا۔
اچانک اندر سے آواز آئی۔

”خون ٹیڈ کرو۔“

جاؤ۔ گلو ختم ادھر سے جا کر دیکھو۔ کیا ہو رہا ہے۔ میں یہیں بیٹھی ہوں۔
تمو دیں پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

اچھا بی بی جی۔ اگلو دوڑتا ہوا اس طرف چلا گیا۔
کتنی ہی دیر بیت گئی۔

اس نے پھر کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ اب کے منصور کے قریب قہمدہ کمر
کھڑی تھیں۔ وہ آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر دعا کرتے ہوئے نار و قطار روڑی تھیں۔

تمو کا دل کٹ گیا۔

کافی دیر بعد گلو آیا۔

اتنی دیر کر دی۔ گلو۔؟

بی بی جی۔ وہ صاحب کے لئے خون چاہیے۔؟
کیا۔

ڈاکٹر کہتے ہیں۔ کہ اگر صاحب کو خون مل جائے تو زندگی بچ سکتی ہے۔؟
تو پھر۔؟ اس کے لیے میں کچھ خوشی تھی۔

مگر کسی کانبر بھی نہیں ملا۔ اسپتال میں بھی اس نمبر کا خون نہیں ہے۔
گلو۔ چلو جلدی سے مجھے بڑے ڈاکٹر کے پاس لے چلو۔

مگر۔ کیوں بی بی جی۔

کچھ نہ پوچھو۔ چلو۔!

گلو بے چارہ حیرت سے مکتا ہوا اسے اسپتال کے دوسرے حصے میں لے آیا۔
وہاں سے انھوں نے سول سرجن کا کمرہ پوچھا۔ ایک نرس نے کمرہ بتایا۔ تو
تمو بغیر کچھ اندر چلی گئی۔

”فرمائیے۔؟ عمر سیدہ انسان جو کچھ لکھ رہا تھا۔ سر اٹھا کر بولا۔

”جی۔ وہ ڈاکٹر منصور۔؟“

”ہاں۔ کیا ہوا۔ خیریت ہے۔؟“ سرجن کچھ گھبرا گیا۔

جی ہاں۔ مکروہ بیچ جائیں گے۔

”اگر اس نمبر کا خون مل گیا تو؟“ سرجن کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

”تو میرا خون ٹیسٹ کیجیے۔“

آپ کا؟“ سرجن حیرت سے بولے۔

جی ہاں۔

آپ تیار ہیں۔

”جی ہاں۔ دیر نہ کیجیے ڈاکٹر۔“

اچھا۔ سرجن نے فوراً گھنٹی بجائی۔ اور سرج لائے کو کہا۔ نرس سرج اور کچھ آؤں اور فوراً لے آئی۔

پھر اس نے تم کو بازو میں سوئی چھو کر تھوڑا سا خون نکال لیا۔ اور فوراً لیبارٹری میں بھیج دیا۔

آپ بیٹھیے۔ ابھی رپورٹ آئے گی۔ تو کچھ بتا سکوں گا۔! سرجن نے کہا۔

تم کو کارواں رُواں دعا میں مانگ رہا تھا۔

آپ ڈاکٹر منصور کی کیا لگتی ہیں؟

جی میں۔ وہ انھوں نے ایک مرتبہ میری مدد کی تھی! وہ جھوٹ بول گئی۔

”آپ کی مدد؟“

”جی ہاں۔ میری ماں کے لئے انھوں نے اپنا خون دیا تھا۔!“

تمو جلدی سے بولی۔

آفرین ہے۔ ڈاکٹر منصور واقعی اچھے انسان ہیں۔ خدا کرے وہ بیچ جائیں۔

ایکسی ڈنٹ بُری طرح ہوا ہے۔ کچھ عجیب اتفاق ہے۔ کل وہ یہاں اپنا اُلتعفیٰ

دے کر گئے ہیں۔ کچھ پریشان تھے۔

تمو باتیں سن رہی تھی۔ اور ایک ایک بات اس کے دل پر فشر کی طرح

لگ رہی تھی۔

کچھ ہی دیر میں رپورٹ آگئی۔ ڈاکٹر رپورٹ پڑھ رہا تھا۔ اور تم کو دل

تیزی سے دھڑک رہا تھا۔

آپ کا نمبر مل گیا ہے۔ ڈاکٹر خوش ہو کر بولا۔

”بیچ۔!“

اُسے یوں لگا۔ جیسے ایک بہت بُری خوشی کی خبر سن لی تھی۔

تو پھر جلدی کیجیے؟ وہ بے تابی سے بولی۔

”رُشا باش ہے لڑکی۔ ایسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں۔ جو کسی کی نیکی یا

رکھتے ہیں۔؟“

ڈاکٹر تمو کو ایک اور کمرے میں لے گیا۔ اور خون نکالنے کے لوازمات

منگوانے لگا۔

کوئی بیڈ خالی ہے۔؟ سرجن نے دوسرے ڈاکٹر سے پوچھا۔

جی نہیں۔ اس وقت کوئی بھی خالی نہیں۔

پھر ان خانوں کو کہاں رکھا جائے گا۔

سُر۔ فی الحال ڈیوٹی روم میں ہی۔

”اچھا۔!“

ڈاکٹر نے پہلے تھو سے ایک کاغذ پر دستخط کروائے۔ اور پھر سرج اُس کے بازو میں لگا دیا۔

ڈاکٹر۔ میرے جسم کا آخری قطرہ بھی نکال لیجئے۔ منصور کی جان بچ جائے۔
تو نے خوشی سے کہا۔

جتنا ضرورت ہے لے لیں گے۔ اور آپ بھی مَرت گھر آئیں۔

آپ ٹھیک رہیں گی۔ کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا۔ دوائیاں کی پوری
کر دیں گی۔ وہ صرف مسکرا کر رہ گئی۔

خون نکال کر ڈاکٹر منصور کی طرف جانے لگے تو تھو نے کمزوری آواز میں کہا۔
ڈاکٹر صاحب۔ ایک التجا ہے۔ ۹

”کیا۔ ۹“

”کسی سے ذکرِ مَرت کیجیے گا کہ خون کس نے دیا ہے۔ ۹“

بہت اچھا۔! ڈاکٹر چلا گیا۔

نرسوں نے اُسے ڈیوٹی روم میں بیڈ پر لٹایا۔ اور گلو کوڑکی پوتلیں

لگا دیں۔ اُس کا دل لمحہ بہ لمحہ ڈوب رہا تھا۔

ادھر منصور کو خون مل رہا تھا۔ اور اس میں زندگی کے آثار پیدا

ہو رہے تھے۔

”خون مل گیا ہے۔ ۹“ شفیق الرحمن باہر آکر بولے۔

”سیج۔ ۹ کس نے غرابانی کی مجھ پر۔ فہمیدہ بیگم بولیں۔

بہت اچھا۔ مگر ڈاکٹر نہیں بتاتے۔

مسٹر وراجمد جو آج ہی صبح پہنچے تھے بولے۔

”جو بھی ہے شکم ہی رہے۔ اُس کی ماں کا کیسچ ٹھنڈا رہے“

رشیدہ نے دُعا دی۔

مبارک ہو۔ اب ڈاکٹر منصور خطرے سے باہر ہیں۔! ڈاکٹر نے یہ غرہ

سنایا۔ تو فہمیدہ بیگم سجدے میں گر پڑیں۔

نامیدہ سجدے سے لیٹ گئی۔ رشیدہ خدا کا شکر ادا کرنے لگیں۔

اب تو تھو لوگ گھر چلو۔ شام کو پھر آجانا۔ مسٹر وراجمد بولے۔

اچھا۔! وہ سب منصور کو ایک نظر دیکھ کر باہر نکل آئیں۔

ٹیکسی جو نہی گھر کے سامنے رکی۔ اما دوڑ کر آئی۔

”بی بی جی۔ خیریت ہے نا۔ ۹“

ہاں اما۔ اللہ نے ہم سب کی دُعا میں سُن لی ہیں۔

گھر پہنچتے ہی ناہید نمو کے لئے دوڑی۔ اُس نے سارے گھر میں تم کو تلاش کیا۔ مگر اُس کا کہیں پتہ نہ تھا۔

اما۔ تم کہاں ہے۔؟ ناہید نے پوچھا۔

”وہ قسمت کی ماری تو اُسی وقت کہیں چلی گئی تھی۔!“ اما بولی۔؟
ناہید دھک سے رہ گئی۔

”چلو سوست گئی۔ دیکھا آپا۔ کتنی سفر قدم لڑکی ہے۔؟“ رشیدہ بولی۔

”واقعی۔ آج میں قائل ہو گئی۔! ہمیدہ بیگم نے کہا۔

”ہاں بیگم۔ وہ حاجی عبدالصمد کے ہاں سے آدمی آیا تھا۔ میں نے کہلوادیا
اما پھر بولی۔

اچھا کیا۔ ایسے وقت میں ہمیں کیا سوچہ رہا ہے۔

تمو کہاں چلی گئی خالہ۔؟ ناہید نے کہا۔

”بھاڑ میں جائے تمو۔ اب نام منت لینا۔ اُسی کے لئے تو یہ دن دیکھنا
پڑا ہے۔!“ ہمیدہ بیگم غصے سے بولیں۔

رشیدہ نے بکرے ذبح کرا کے محتاجوں میں تقسیم کرائے۔ ہمیدہ بیگم
بھی نیاز نذر کر رہی تھیں۔!

تھوڑی دیر بعد شفیق الرحمن نے آکر بتایا کہ منصور کو ہوش آگیا ہے
اور اب وہ باتیں بھی کر رہے ہیں۔

ہمیدہ اور رشیدہ نے شکرانے کے نفل ادا کیے۔

رشیدہ نے منع کر دیا کہ تم کو ذکر فی الحال شفیق الرحمن سے نہ کیا جائے۔

شام کو سب ہی اسپتال کے لئے روانہ ہو گئے۔ جوہی وہ منصور کے
کمرے میں داخل ہوئیں۔ ڈاکٹر پیچھے بہٹ گئے۔

ہمیدہ نے کئی بار بیٹے کی پیشانی چومی۔

ناہید بھائی کے ہاتھ چوم رہی تھی۔ تجرہ قریب کھڑی تھی۔ اور رشیدہ
بلاٹیں لے رہی تھی۔ مگر منصور کی نظر میں کچھ اور تلاش کر رہی تھیں۔

آخر وہ آہستہ سے بولے۔

”ناہید۔؟“

وہ بھائی کے قریب ہو گئی۔

تمو نہیں آئی۔؟ وہ کمزور آواز میں پوچھنے لگے۔

”نہیں۔! ناہید اُداس سی ہو گئی۔“

مسٹر وراحد اور شفیق الرحمن کرسیوں پر بیٹھے تھے۔

معلوم نہیں ہو سکا۔ خون کس نے دیا ہے؟ مسٹر وراحد نے پوچھا۔

”پتہ نہیں۔ ڈاکٹر نے نہیں بتایا۔!“

اتنے میں ڈاکٹر کمرے میں آگیا۔

بیلوڈاکٹر۔ وہ منصور کی طرف دیکھ کر مسکرائے۔

”اب کیسے ہو۔“

”اچھا ہوں ڈاکٹر۔“

”ڈاکٹر صاحب۔“ ”سچے۔“ ”نرس آکر بولی۔“

”یس۔!“

”وہ ڈیوٹی روم والی مریضہ کو کہاں لے جائیں۔“ ”جگہ بالکل نہیں ہے۔“
”ڈیوٹی روم میں نیا آپریشن والا مریض آ رہا ہے۔“

”آج کل جگہ بالکل نہیں رہی ہے۔“ ڈاکٹر مسرور احمد سے مخاطب ہوئے۔
”ایک ایک کمرے میں چار چار مریض ہیں۔“

”مریضہ کی حالت بھی سیریس ہو چکی ہے۔ نرس لے بتایا۔!“
”ہیں۔!“ ڈاکٹر چونک گئے۔ ”وہ کیسے۔“ ”گلو کو زہنیں لگایا۔“

”لگایا ہے۔“ ”مگر پھر بھی!“ ”واب۔“ ”نرس۔“ ”میرے کمرے میں لے آئیے۔“
”یہاں جگہ ہے! منصور بولے۔“

”مگر۔“ ڈاکٹر تمہیں تکلیف ہوگی۔“ ”نہیں۔“ ڈاکٹر۔!“ ”اور پھر مریضہ بھی تو
تمہاری ہی ہے۔!“ ڈاکٹر کے منہ سے اچانک نکل گیا۔ ”کیا مطلب۔“ ”مسرور احمد
بولے۔“ ”وہ۔“ اسی مریضہ نے ڈاکٹر منصور کے لئے خون دیا ہے اور کافی مقدار میں!

”اچھا۔“ پھر تو اسے ضرور لائیے۔!“ میں اسے دیکھوں گی۔“ ”فہمیدہ بیگم نے کہا۔“
”اوکے۔“ ڈاکٹر کہتے ہوئے باہر نکل گیا۔

”تھوڑی دیر میں کمپاؤنڈ ریسٹریکچر پر کسی کو لائے۔“ ”پلنگ پہلے ہی نرسوں
نے بچھا دیا تھا۔“ ”سب ہی اسے دیکھنے کے لئے بے تاب تھے۔“ ”جس نے منصور
کی جان بچائی تھی۔“ ”جب کمپاؤنڈ ریسٹریکچر پر ڈال چکے۔“ ”تو ڈاکٹر آگے بڑھا۔“
”ڈاکٹر۔“ ”اس کا منہ کھولے۔“

”ہوں۔“ ”اجوہنی ڈاکٹر نے کپڑا منہ سے ہٹایا۔“ ”تو سب حیرت سے دنگ رہ گئے۔“
”تمو۔“ ”سب کے منہ سے نکلا۔“ ”ناہیدہ قریب آگئی۔“ ”تمو۔“ ”

”منصور زہریلے کڑکھے۔“ ”کیا آپ اسے جانتے ہیں۔“ ڈاکٹر منصور کو منع
کرتے رہے۔“ ”مگر یہ تو کہہ رہی تھی کہ کسی کو بالکل نہ بتایا جائے کہ خون کس نے دیا
مگر وہ اس کے قریب پہنچ چکا تھا۔“ ”اور اس کا چہرہ میں لیتے ہوئے بولا۔“

”تمو۔“ ”بولو تمو۔“ ”تمو نے آنکھیں کھول دیں۔“ ”اس کا چہرہ سفید پڑ
گیا تھا۔“ ”اور ہونٹ کانپ رہے تھے۔“ ”فہمیدہ بیگم اور رشیدہ اس سے لپٹ گئیں۔“
”تمو۔“ ”بولو خدا کے لئے۔“ ”ناہیدہ اس کا ہاتھ چوم رہی تھی اور بختہ حبیج گرو رہی تھی۔“
”شفیق الرحمن اور مسرور احمد ڈاکٹر کے لئے دوڑے۔“ ”تمو۔“ ”منصور احمد اپنا چہرہ
اس سے مٹھنے پر رگڑتے ہوئے بولے۔“

”منصور۔“ ”وہ بمشکل بولی۔“ ”جان منصور۔“ ”یہ کیا ہو گیا تمہیں۔“ ”ڈاکٹر میری تمہو کو
بچاؤ۔“ ”نہیں تو میں جان دے دوں گا۔“ ڈاکٹر۔!“ ”دل ہلا دینے والی حبیج کے ساتھ منصور
لے کہا۔“ ڈاکٹر نے بغض دیکھی اور نرس کو انکاش لانے کے لئے کہا۔“ ”اس لمحے تمو کے لب

سنگ دل رشیدہ شفیق الرحمن کے قاموں پر گر کر زار و قطار رو رہی تھی۔
اور وہ گم گم کھڑے تھے۔ سامنے چادر میں لپیٹی ہوئی وہ ہستی پڑی تھی جس نے
ظلم کے خلاف آواز بلند نہ کی۔

تب ان کا دل غم سے بھٹنے لگا۔ وہ منصور سے لپٹ گئے۔ جو دنیا و ما فیہا
سے بے خبر بے ہوش پڑا تھا۔ ڈاکٹر اُس پر جھکے ہوئے تھے۔
اور پھر تنو کی لاش کو گھر لے جایا گیا۔ تو منصور کو ہوش آگیا۔ مگر صدمے سے
اُس کے دماغ کی رگیں بے کار ہو چکی تھیں۔

وہ کسی کو بھی نہ پہچانتے تھے۔
ڈاکٹروں نے فیصلہ دے دیا۔ کہ اب یادداشت کبھی واپس نہ آئے گی۔
یہی بے کل اور پاگل رہیں گے۔

فہمیدہ بیگم اور ناہیدہ نے اپنا سر پیٹ لیا۔
ادھر تنو کے سفر کی آخری تیاری ہو رہی تھی۔
صرف تنو کی۔

دفنانا دیکھ بھال کے حسرت زدہ کی لاش
لیٹی ہوئی کفن سے کوئی آرزو نہ ہو

ختم شد

کا پیسے۔ میں منحوس تھی نا؟ نہیں میری سچی۔ مجھے معاف کر دو۔ میں نے تمہیں بہت
سنایا۔ رشیدہ کو بولوں گا۔ رہا تھا جیسے اُس کا حلق جل رہا ہے۔ تو چوتھی ہو جائیں
تیری شادی خود منصور سے کر دیں گی۔ رشیدہ چیخ کر بولی۔ خا۔ کہ۔! تم کو کب
کا پیسے۔ ارے کوئی خدا کے لئے اس کو بچائے۔؟، فہمیدہ چیخی۔ کچھ لمحے تنو کی نظر
ناہیدہ پر لگی ہیں۔ وہ مسکراتی اور ہنسنے کی طرف دیکھنے لگی منصور نے اس کا
سر دھاتھ بکھڑا لیا۔ اور بولے۔ تنو۔ مت جانا۔ میں مر جاؤں گا۔ تم مجھے زندگی دے کر
مت جانا، تنو نے اس کا ہاتھ زور سے پکڑ لیا۔ اور اُس کی آنکھیں سمجھنے لگی ہیں
سائنس کھڑنے لگا منصور نے دیوار کے ساتھ ٹکڑی ماری۔ اور پھر اُس کا اسی کے
ہاتھ میں ڈھیلا پڑ گیا منصور نے اس کا ہاتھ آنکھوں سے لگایا اور پاگلوں کی طرح
چومنے لگے۔! رشیدہ زور سے چیخی۔ ”منصور ہمیشہ ہو کر گر پڑے۔ ناہیدہ دھاریں
مار مار کر رونے لگی۔ اور فہمیدہ بیگم نے اُس کی گھٹی آنکھیں بند کر کے اُس پر کپڑا ڈال
دیا اور بے قرار ہو کر رونے لگیں۔

باہر چیخ چیخ کر رو رہا تھا۔ ہٹے۔ بی بی جی۔ اچھی۔ بی بی جی۔
جنت نے اپنا دوپٹہ اس پر ڈال دیا۔ اور بولی منصور تمہارا ہے تنو۔ تمہارا ہے۔
تمہاری اماں کے پاس پہنچ گئی۔ اپنے آباؤ کو بھی اُس نے دیکھ لیا۔ اپنی اُمی کو بھی
پہچان لیا۔ اور اس کی پیاری دادی اماں بھی اُس بد نصیب کو دیکھ رہی تھی۔ انھیں
غم تھا۔ کہ ان کی تنو دکھ جھیل کر اٹھ آئی۔